ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اپریل ۱۹۹۳

حقوقِ اطفال نمبر

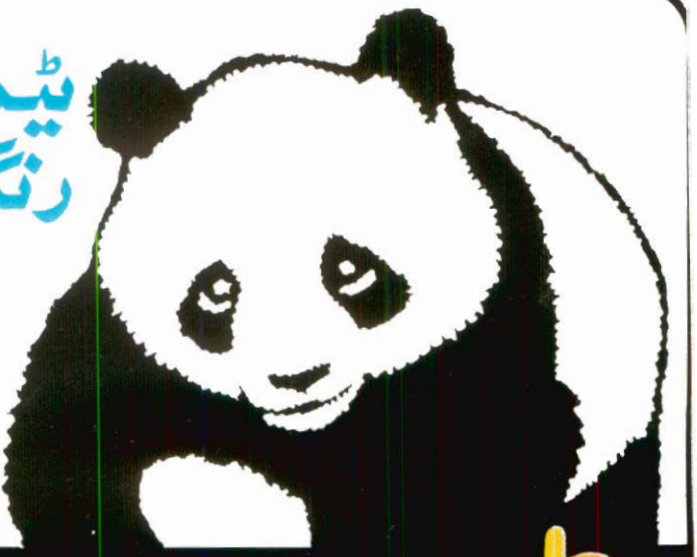

ٹیمپو کی دُنیا
رنگوں کی دُنیا
ٹیمپو
فائبر ٹِپ
SAYYED
سید انجینئرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۴۰-۱ احمد پارک گارڈن ٹاؤن لاہور۔ پاکستان۔

آدابِ سفر

اپنے عزیزوں کو لینے یا رخصت کرنے جب بھی آپ ریلوے سٹیشن آئیں تو پلیٹ فارم ٹکٹ لینا نہ بھولیں ہو سکتا ہے کہ بعد میں آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے

ایک قابلِ اعتماد نام پاکستان ریلوے

محکمہ تعلقات عامہ

اوورسیز پاکستانیز فاؤنڈیشن — آپ کی بہبود کے لیے ہر دم کوشاں

سمندر پار پاکستانیوں کے ذہین بچوں کیلئے

MERIT AWARDS میرٹ ایوارڈ

سمندر پار پاکستانیوں کے ان ذہین بچوں سے "میرٹ ایوارڈ" کے لیے مجوزہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں جو درج ذیل شرائط پر پورے اترتے ہوں۔

(الف) درخواست دہندہ کے والدین (والد/والدہ) اوورسیز پاکستانیز فاؤنڈیشن کے باقاعدہ ممبر ہوں۔

(ب) درخواست دہندہ نے تعلیمی سال 1992 میں اپنے بورڈ یا یونیورسٹی امتحان میں 80 فیصد یا گریڈ اے حاصل کیا ہو یا اس کا نام پہلی دس پوزیشنوں میں شامل ہو۔

(ج) درخواست دہندہ گورنمنٹ یا گورنمنٹ سے الحاق شدہ تعلیمی ادارے کا باقاعدہ طالب علم ہو۔

(د) جو طلباء و طالبات بیرون ملک پاکستانی سکولوں/کالجوں میں پڑھتے ہیں اور یہ سکول/کالج فیڈرل بورڈ اسلام آباد سے الحاق شدہ ہوں، اس ایوارڈ کے مستحق ہیں۔

"میرٹ ایوارڈز" "Merit Awards" اعلیٰ کارکردگی کے ایوارڈ اعزازی سرٹیفکیٹ کے ساتھ ساتھ انعام یا نقدی کی صورت میں مڈل تا پوسٹ گریجویٹ کلاسز تک دیا جائے گا۔

درخواستیں ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ ڈویژن اوورسیز پاکستانیز فاؤنڈیشن اسلام آباد میں 25 مارچ 1993 سے پہلے پہنچ جانی چاہئیں۔ میرٹ ایوارڈ کے درخواست فارم زیرِ دستخطی یا او۔پی۔ایف کے درج ذیل دفاتر سے بھی مفت حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

او۔پی۔ایف ریجنل آفس، 1-ایم، گلبرگ III، فیروز پور روڈ، لاہور۔
او۔پی۔ایف ریجنل آفس، ہاؤس 212 ڈی، کے ڈی اے سکیم نمبر 1 اے، کراچی۔
او پی ایف ریجنل آفس، 3 زرغون روڈ، نیشنل سیونگز سنٹر، عقب امداد ہوٹل، کوئٹہ۔
او پی ایف ریجنل آفس، 122 - الف - 2، میرپور، آزاد کشمیر۔

علاوہ ازیں درخواست فارم پاکستانی سفارت خانوں اور بیرون ممالک تعلیمی اداروں سے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈپٹی مینیجر (ایجوکیشن)، ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ ڈویژن
اوورسیز پاکستانیز فاؤنڈیشن 30 ای، یونین پلازہ، جناح ایونیو (بلیو ایریا) اسلام آباد فون: 9-812456

adage

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد نمبر ۱۴ شمارہ نمبر ۱۰
شوال / ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ اپریل ۱۹۹۳ء

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

مدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
منتظمِ اعلیٰ
تجمل حسین چشتی
مدیرِ اعزازی
طاہر مسعود
مجلسِ ادارت
منیر احمد راشد ، محمد عمر احمد خان
نمائندہ امریکہ
عبدالرشید خان

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
○ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۱۱۵۸۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاہد علی ○ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

قیمت ۱۲ روپے
۸ درہم ۸ ریال

حُسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے ——— ادارہ ——— ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات ——— ادارہ ——— ۹
مدیرِ اعزازی کا صفحہ ——— ادارہ ——— ۱۰
وہ دن ضرور آئے گا ——— ھُما طاہر ——— ۱۱
رہائی ——— شگفتہ شمیم ——— ۱۴
روشن چہرے تاریک مستقبل ——— شیخ تاج محمد ——— ۲۱
رمضان اور عید (نظم) ——— شمع انعام ——— ۲۴
زندہ بھوت ——— ذیشان بن صفدر ——— ۲۵
ذرا سی بھول ——— طاہر مسعود ——— ۳۰
ڈبو ——— الف خان ——— ۳۵
اپنا گھر ——— نعیم عزیز/عُمر خان ——— ۳۹
عجب دن تھے وہ بچپن کے (نظم) ——— حفیظ الرحمٰن احسن ——— ۴۶
ہمیں کچھ ہو گیا تھا ——— نثار احمد زبیری ——— ۴۸
محنت کش بچے ——— اشفاق احمد نان ——— ۵۲
بچاؤ ——— اشتیاق احمد ——— ۵۵
خرم مر رہا ہے ——— ڈاکٹر زعیم الحق ——— ۶۲
میرے وطن کے بچے (نظم) ——— محمد عمر احمد خان ——— ۶۷
مَیں بھی تو آپ کی بیٹی ہُوں ——— صائمہ دلدار ——— ۶۸
بچوں کے بیوپاری ——— شیخ تاج محمد ——— ۷۱

حسنِ ترتیب

بوجھو تو جانیں	ادارہ	۷۶
بے سہارا	فاروق عادل	۸۰
(نظم) یتیموں کی فریاد	عبدالقادر	۸۴
اقوامِ متحدہ کی خدمت میں	ادارہ	۸۷
مستقبل کا مستقبل	محمد عادل منہاج	۹۲
زولوجیکل گارڈن میں	طاہر مسعود	۹۶
چوٹ	محمد عمر احمد خان	۱۰۰
ذمہ داری	سید کاشان جعفری	۱۰۷
جمی	محمد عارف عثمان	۱۱۰
امتحان ہے آپ کی ذہانت کا	ادارہ	۱۱۵
گدگدے	لطائف	۱۱۹
ابو کی واپسی	نزہت کلیم	۱۲۳
ریمانڈ ہوم کے قیدی بچے	فتح محمد برقی / رعنا صبا	۱۲۷
(نظم) یتیم بچہ	مستانہ جوگی	۱۳۱
تم بچے نہیں رہے	محمد ارشد سلیم	۱۳۴
بخدمت جناب	خطوں کے جواب	۱۳۸
پلمبر	کلیم چغتائی	۱۴۱
اگر ایسا ہو جائے	عابد محمود علی	۱۴۸
قلم قتلے	ننھی تحریریں	۱۵۱

تاریخ کے دریچے سے

ایک رات خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ اپنے ایک رفیق ابنِ عباس کے ہمراہ بھیس بدل کر گشت پر نکلے۔ ایک مکان سے کچھ بچوں کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے مکان پر دستک دی اور اندر داخل ہو گئے۔ اندر ایک بوڑھی عورت نے چولہے پر دیگچی چڑھا رکھی تھی اور بار بار بچّوں سے کہتی تھی "چپ ہو جاؤ لال۔ ابھی ہنڈیا پکی نہیں۔"

حضرت عمرؓ دیر تک کھڑے دیکھتے رہے، پھر بڑھیا سے کہا۔ "بچے بھوک سے بلک رہے ہیں اور تم ہنڈیا اُبالے جارہی ہو۔ اُبالے جارہی ہو"؟

بڑھیا نے غمگین لہجے میں کہا "آخر اور کیا کروں۔ ہنڈیا میں صرف پانی ہے اور کنکر ہیں، چاہتی ہوں کے بچے کسی طرح انتظار کرتے کرتے سو جائیں"۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر بڑھیا سے کہا۔ "ہم ابھی آتے ہیں، بچّوں کو سونے نہ دینا"۔

پھر حضرت عمرؓ، ابنِ عباسؓ کے ساتھ جلدی سے اپنے گھر پہنچے اور آٹے کا ایک تھیلا، کچھ مسالے اور ایندھن اپنے کاندھوں پر لادا، روغن کا ایک ڈبہ ابن عباس کو پکڑایا اور بڑھیا کے مکان کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں ابنِ عباس سے کہتے جارہے تھے "تیزی سے قدم بڑھاؤ، بچّے سو نہ جائیں"۔ بوجھ کی وجہ سے حضرت عمرؓ کی کمر دہری ہوئی جارہی تھی اور پیشانی پسینے سے تر تھی۔ ابنِ عباس نے کئی بار درخواست کی کہ اپنا بوجھ مجھے دے دیجئے لیکن حضرت عمرؓ نے ہر بار یہی کہا کہ "بھائی! کیا قیامت کے روز بھی تم میرے گناہوں کا بوجھ اٹھاؤ گے؟"

مکان پر پہنچنے کے بعد حضرت عمرؓ نے خود کھانا تیار کیا اور پھر بچّوں کو پیٹ بھر کے کھلایا۔ جب بچّے کھا چکے تو حضرت عمرؓ ان سے باتیں کرتے اور ہنستے رہے۔ بچّوں کے سو جانے کے بعد بڑھیا نے بتایا کہ چند ماہ پہلے بچّوں کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اب دانے دانے کی محتاجی ہے اور ایسا کوئی آدمی نہیں جو میری حالت حضرت عمرؓ کو جا کر بتائے"۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ "فکر نہ کرو خلیفہ کو تمہاری حالت سے آگاہ کر دوں گا اور تمہارے لئے وظیفہ مقرّر کروا دوں گا۔ یہ وظیفہ تمہیں گھر پر مل جایا کرے گا"۔

حضرت عمرؓ گھر لوٹے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

دنیا میں دو طرح کے ممالک ہیں۔ ایک وہ جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے، جہاں کے بچے نہایت خوش نصیب ہیں کیونکہ ان ملکوں میں ان کی غذا، دیکھ بھال، تعلیم اور تفریح کے مسائل حل کر لئے گئے ہیں اور بچوں کو ان کے حقوق دے دیئے گئے ہیں۔

دوسرے قسم کے ملک وہ ہیں جنہیں ترقی پذیر ممالک کا نام دیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ غریب ممالک ہیں، ان کے پاس ذرائع اور وسائل بہت محدود ہیں۔ چنانچہ ایسے ملکوں میں بچوں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ لاکھوں بچے تو ایسے ہیں جو پیدا ہوتے ہی دوا دارو نہ ملنے کی وجہ سے مر جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں ان کا مستقبل بھی تاریک ہوتا ہے۔ وہ گندے غلیظ ماحول میں پرورش پاتے ہیں اور ساری عمر غربت اور جہالت کے دلدل میں دھنسے رہتے ہیں۔

دیکھا جائے تو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے بچے دو بالکل ہی مختلف دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ان میں ایک دنیا روشن ہے، توانا ہے۔ زندگی کے سارے شوخ رنگ اس ماحول کا حصہ ہیں جب کہ دوسری دنیا تاریک ہے، وہاں محرومیاں اور مایوسیاں ہیں۔ ایک دنیا کے بچے شاندار تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر کے اور بہترین تفریح گاہوں میں کھیل کود کر بڑے ہوتے ہیں چونکہ بچپن سے انہیں معاشرے کی محبت اور توجہ حاصل ہوتی ہے اس لئے وہ بڑے ہو کر معاشرے کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری دنیا کے بچے گیراجوں، کارخانوں، دکانوں اور فٹ پاتھوں پہ محنت مشقت کرتے ہیں، بھیک مانگتے ہیں، اغوا کر لئے جاتے ہیں، بیگار کیمپ پہنچا دیئے جاتے ہیں، والدین کی بد سلوکی سے تنگ آ کے گھروں سے بھاگ نکلتے ہیں، جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں اور کبھی نہ کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ یہ واقعی بد نصیب بچے ہوتے ہیں۔ یہی بچے آج ساری دنیا کا تشویش ناک مسئلہ ہیں اور سچ پوچھیے تو یہ بچے مسئلہ بھی ہیں اور انسانیت کے دامن پہ ایک بد نما داغ بھی۔ ہمیں ان ہی بچوں کے بارے میں سوچنا ہے کہ آخر ان کی تقدیر کس طرح بدلی جا سکتی ہے۔ دنیا میں بہت سے ادارے ان بچوں کا مستقبل سنوارنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی اپنی سطح پر ان عالمی اور مقامی اداروں سے تعاون کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ جب تک اس زمین پر ایسے کروڑوں بے آسرا اور بے سہارا بچے موجود ہیں، یہ دنیا مہذب، اور انسان دوست نہیں کہلا سکتی۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

مدیرہ اعزازی کا صفحہ

چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ دعوہ اکادمی کے "شعبہ بچوں کا ادب" کی جانب سے ہمیں "حقوقِ اطفال نمبر" نکالنے کی دعوت ملی۔ اس دعوت میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی تھی کہ بچّوں کے عالمی ادارہ اطفال یونیسیف کی خواہش ہے کہ بچّوں کے تمام رسائل اس موضوع پر اپنے خصوصی شمارے شائع کریں اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی تھی کہ جس رسالے کی پیش کش سب سے اچھی ہوگی، وہ انعام کا حق دار ہو گا۔ یونیسیف کی طرف سے یہ ہدایت بھی موصول ہوئی کہ ۱۹۸۹ء میں اقوامِ متحدہ نے بچوں کا جو عالمی معاہدہ منظور کیا تھا، حقوقِ اطفال نمبر اس معاہدے کی روشنی میں مرتّب کیا جائے۔

فوری طور پر یہ دعوت ہمارے لئے پریشان کن تھی کیونکہ ان دنوں ہم "ایجادات نمبر" کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ دوسری بات یہ کہ ایک ڈیڑھ سال پہلے ہی ہم "اطفال نمبر" شائع کر چکے تھے۔ اس ضخیم نمبر میں ہم نے بچّوں کے مسائل اور حقوق کے بیشتر پہلوؤں پر مضامین، فیچر اور کہانیاں پیش کر دی تھیں۔ پہلے تو یہ ارادہ ہوا کہ اس مقابلے میں شریک ہونے سے معذرت کر لی جائے لیکن معاملہ بچّوں کے حقوق کا تھا اس لئے پیچھے ہٹنا آنکھ مچولی کے لئے پیٹھ دکھانے کے برابر تھا۔

چنانچہ آپ کی خدمت میں "حقوقِ اطفال نمبر" پیش کیا جا رہا ہے۔ "اطفال نمبر" کے بعد ہماری یہ دوسری پیش کش انشاء اللہ بچّوں کے ادب میں ایک خوشگوار اور صحت مند اضافہ ثابت ہوگی۔

ایک وضاحت یہ ہے کہ چونکہ یونیسیف نے اس خصوصی شمارے کو اقوامِ متحدہ کے تحت بچّوں کے عالمی معاہدے کی روشنی میں ترتیب دینے کی ہدایت کی تھی۔ لہٰذا اس شمارے کی ہر تحریر اس عالمی معاہدے کی کسی نہ کسی شق سے متعلق ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر تحریر پہ پہلے اس شق کا خلاصہ درج کیا گیا ہے پھر اس کے مرکزی خیال کے گرد وہ تحریر لکھی گئی ہے۔ اس طرح آنکھ مچولی کا یہ "حقوقِ اطفال نمبر" عالمی معاہدے کی تفسیر، تعبیر اور تشہیر کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔

آخری بات یہ کہ آنکھ مچولی نے یہ شمارہ انعام جیتنے کے لئے نہیں نکالا۔ ہمیں ہمارا اصلی انعام اس دن ملے گا جس روز ان لاکھوں بچّوں کو ان کے حقوق دے دیئے جائیں گے جن کے لئے ہم نے دن رات ایک کر کے یہ شمارہ ترتیب دیا ہے۔

یہ شمارہ دراصل اس ملک کے لاکھوں بچّوں کی خدمت کی ایک حقیر سی کوشش ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

وہ دن ضرور آئے گا

ہما طاہر

> تمام ملک اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ معاہدے میں درج بچوں کے حقوق پر عملدر آمد کے لئے ضروری قانونی اور انتظامی کارروائی کریں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دنیا میں کروڑوں بچے ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا، جنہیں پینے کے لئے صاف پانی میسّر نہیں ہے، رہنے کے لئے اچھی فضا اور اچھا ماحول ان کی قسمت میں نہیں ہے۔ وہ تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ وہ پیدا ہوتے ہی صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے طرح طرح کی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان میں لاکھوں بچے مر جاتے ہیں یا پھر جسمانی معذوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ دنیا ان کے لئے انتہائی تکلیف دہ جگہ ثابت ہوئی ہے۔ وہ زندگی بھر دُکھ اٹھاتے ہیں اور خوشی کے لمحات اگر انہیں ملتے بھی ہیں تو بہت مختصر وقت کے لئے۔

ترقی یافتہ اور دولت مند ملکوں میں تو بچوں کے ان مسائل کو بڑی حد تک حل کر لیا گیا ہے۔ لیکن ترقی پذیر ممالک جیسے پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا وغیرہ میں آج بھی غریب گھرانوں کے بچے مٹی چاٹ چاٹ کر پروان چڑھتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف کا اندازہ ہے کہ ان ملکوں میں بچوں کے بنیادی مسائل حل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ سالانہ ۲۵ ارب ڈالر خرچ کئے جائیں۔ یعنی ۲۵ ارب ڈالر سالانہ خرچ کر کے بچوں کو بیماریوں سے بچایا جا سکتا ہے، انھیں غذا اور پینے کے لئے صاف پانی فراہم کیا جا سکتا ہے، ان کے ماحول کو صاف ستھرا رکھا جا سکتا ہے اور سب

سے بڑھ کر انہیں تعلیم دلائی جا سکتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ رقم بہت زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ مختلف ملکوں میں حکومتیں اپنے ایک ایک منصوبے پر اس سے زیادہ رقم خرچ کر دیتی ہے۔ مثلاً برطانیہ اور فرانس کے درمیان جو سرنگ تعمیر ہو رہی ہے اس پہ ۲۵ ارب ڈالر سے دو تین گنا زیادہ رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ ہانگ کانگ میں صرف ایک ہوائی اڈے کی تعمیر پر اس سے زیادہ اخراجات آئیں گے اور یورپ کے باشندے ایک سال میں پچیس ارب ڈالر سے زیادہ کی صرف شرابیں پی جاتے ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ کروڑوں بچوں کی زندگی بچانے اور سنوارنے کے لئے اتنی رقم حاصل کرنا کیا مشکل ہے؟ اس کی وجہ اتنی سی ہے کہ ان غریب بچوں سے کسی ملک کی حکومت کو صحیح معنوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حکومتیں کبھی ان کے دکھوں کو سچائی سے محسوس نہیں کرتی اور نہ ان کے مسائل کو حل کرنے کے لئے جرأت مندی سے کوئی قدم اٹھانے پر تیار ہوتی ہیں۔ غریب ملکوں کے خزانے بڑی بڑی فوج رکھنے اور اسلحہ خریدنے میں خالی ہو جاتے ہیں یا پھر ترقی یافتہ ملکوں سے جو انھوں نے قرضے لئے ہوتے ہیں ان کا سود ادا کرتے رہتے ہیں۔ باقی جو رقم بچتی ہے اس میں انہیں سارے ملک کا نظام چلانا ہوتا ہے۔ ان غریب ملکوں کے بجٹ کا بڑا حصہ بد عنوانیوں اور حکومت کی عیاشیوں میں بھی برباد ہو جاتا ہے تو پھر ان غریب بچوں کی حالت کیسے سدھرے؟ اور انہیں کون سدھارے؟

حقیقتاً بچوں کی حالت کو سدھارنا کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی غربت کو دور کرنے کی کبھی سنجیدگی سے کوشش ہی نہیں کی گئی۔ یقیناً اس کی ذمہ داران ملکوں کی حکومتیں ہی ہیں۔

پھر بھی ان کروڑوں بچوں کی حالت کو سدھارنے کے لئے بہت سے عالمی اور مقامی ادارے اپنی اپنی سطح پر کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں سے وابستہ ہزاروں افراد دن رات اس کوشش میں مصروف ہیں کہ کسی طرح ان بچوں کی سوئی ہوئی قسمت کو جگایا جائے۔ ان اداروں میں مثلاً یونیسیف عالمی ادارہ صحت اور ان جیسے ہزاروں ادارے اور تنظیمیں شامل ہیں۔ ان اداروں نے بچوں کے لئے بہت سی اہم اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ مثال کے طور پر ان اداروں نے طے کیا تھا کہ ۱۹۹۰ تک ترقی پذیر ملکوں میں ۸۰ فیصد بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگا دیئے جائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ انہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی اور اس کے نتیجے میں ہر سال تیس لاکھ بچے موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے ہیں۔ کیا یہ کوئی معمولی کارنامہ ہے؟

آپ کو یہ سن کر تعجب اور افسوس ہو گا کہ ترقی پذیر ملکوں میں ہر روز پانچ سال سے کم عمر کے ۳۵ ہزار بچے مر جاتے ہیں۔ ان میں ۶۰ فیصد بچے بیماریوں کی وجہ سے یا پھر صحت بخش غذا نہ ملنے کی

وجہ سے۔ بیماریوں میں نمونیہ، اسہال اور خسرہ بچوں کو سب سے زیادہ لاحق ہوتا ہے اور یہ وہ بیماریاں ہیں جن کا علاج اب بہت آسان ہو گیا ہے لیکن مرنے والے وہ بچے ہیں جنہیں علاج دوائیاں اور ڈاکٹر دستیاب نہیں ہیں۔

یہ وہ مسائل تھے جن کی وجہ سے آج سے تین سال قبل یعنی ۱۹۹۰ میں اقوامِ متحدہ نے تمام ملکوں کے سربراہوں کی ایک کانفرنس کرائی جس میں ان ملکوں کے صدور یا وزرا اعظم نے بچوں کے فلاح و بہبود کے لئے بہت سی باتیں طے کیں۔ اور یہ عہد کیا کہ وہ بچوں کے مسائل حل کرنے پر توجہ دیں گے۔ اور اس صدی کے آخر تک یہ مسائل حل کرلیں گے۔ انھوں نے جن مسائل کو حل کرنے کا عہد کیا وہ یہ تھے۔ بچوں کے بڑے بڑے امراض پر قابو پانا، انہیں صحت بخش غذائیں فراہم کرنا، ہر شخص کے لئے صاف پانی اور صفائی کی سہولتیں فراہم کرنا، پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کے مرنے کی شرح میں ایک تہائی کمی کرنا اور تمام بچوں کو بنیادی تعلیم فراہم کرنا وغیرہ۔

چنانچہ ستمبر ۱۹۹۲ء تک ۵۰ ملکوں میں ان مسائل کو حل کرنے کے لئے منصوبے بنائے جا چکے ہیں اور ۸۰ ملکوں میں بنائے جارہے ہیں۔ جون ۱۹۹۲ میں اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے جنرل اسمبلی میں بتایا کہ اکیس ملکوں نے اطلاع دی ہے کہ پرائمری تعلیم، ابتدائی طبی نگہداشت، خوراک، پانی اور صفائی کے لئے وہ اپنے بجٹ میں اضافہ کریں گے۔ یہ صورت حال بہت زیادہ اُمید افزا نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر ملکوں میں اس قسم کے منصوبوں پر عمل در آمد اس ملک کے سرکاری افسران کرتے ہیں اور یہ افسران جنہیں بیورو کریسی کہا جاتا ہے، عام طور پر جوش و ولولے سے محروم ہوتے ہیں اور ان کے کام کرنے کا طریقہ اتنا رسمی اور نکما ہوتا ہے کہ ان سے کوئی اچھی اُمید وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی ان اقدامات سے ان ملکوں کے بچوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا۔ اس وقت بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں بچوں کو ہونے والی بہت سی بیماریوں پر قابو پایا جا چکا ہے۔ مثلاً لاطینی امریکہ سے پولیو تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس طرح حفاظتی ٹیکوں سے بیماریوں میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ عالمی ادارے اور بچوں کی فلاح و بہبود کی تنظیمیں اسی لگن اور جذبے سے کام کرتی رہیں تو وہ وقت ضرور آئے گا جب اس دنیا کے بچے بھوک اور معمولی بیماریوں سے نہیں مریں گے وہ ایک خوشحال زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں گے اور بڑے ہو کر اس دنیا کو رہنے سہنے کے لائق ایک دنیا بنائیں گے تاکہ آنے والی نسلوں پر دُکھ اور تکلیف کا سایہ نہ پڑ سکے۔

رہائی

شگفتہ شمیم

بچوں کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ سے بچایا جائے گا جس سے ان کی ترقی میں رکاوٹ پڑے۔

"باجی، باجی نورو کہتا ہے کہ آسمان میں ایک دیو رہتا ہے۔ وہ جب بادل کو زور زور سے چھڑی مارتا ہے تو بادل رونے لگتا ہے۔ اور پھر بارش ہوتی ہے باجی! کیا نورو ٹھیک کہتا ہے؟" میرا چھوٹا بھائی ببلو مجھے ہلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا مگر میرا دھیان کہانی کی کتاب کی طرف تھا اور نظریں ان سطروں کی طرف جس میں شہزادہ ارسلان شہزادی حور بانو کو پانے کے لئے سنگلاخ گھاٹی کو عبور کر رہا تھا۔ اتنے سنسنی خیز موڑ پر کتاب چھوڑ کر ببلو کے بے تکے سوالوں کا جواب دینا میرے لئے بہت مشکل تھا۔

کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ اسے ختم کرنے کے بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ باہر خاصی تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں جل تھل برستی بوندوں کا نظارہ کرنے کے لئے کھڑکی پر جھک گئی۔ بارش سے ہر چیز دُھلی دُھلی سی لگ رہی تھی۔ دور بنے مکانات اور

درخت دھند میں لپٹے ہوئے کسی الف لیلوی کہانی کے منظر معلوم ہو رہے تھے۔ نیچے لان کی جانب سے بلو اور نورو کے ہلکے پھلکے قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں اپنی اپنی قمیص اتارے گیٹ سے باہر بھاگتے دکھائی دیے۔ میں نے پہلے سوچا کہ انہیں بارش میں بھیگنے سے منع کروں مگر ان کی کِھلکھلاتی ہنسی اور چہرے پر بے تحاشا امنڈ آنے والی خوشی نے میرا ارادہ بدل دیا۔

دونوں بہت خوش نظر آرہے تھے۔ اور پانی میں بھیگتے ہوئے عجیب مسخروں جیسی حرکتیں بھی کر رہے تھے۔ کبھی دونوں بازو پھیلا کر دوڑنے لگتے گویا ابھی پرواز کر جائیں گے اور کبھی چہرہ اوپر اٹھا کر منہ میں پانی بھرنے کی کوشش کرتے۔ میں ان دونوں کی شرارتوں سے محظوظ ہو رہی تھی کہ ایک تیز گرجتی ہوئی آواز آئی

"نورو ...... او نورو کے بچے باہر کیا کر رہا ہے؟" یہ ہماری مالک مکان بیگم بٹ کی آواز تھی۔ ان کی آواز سن کر نورو کو کھیلتے کھیلتے سکتہ لگ گیا اور ہنستا کھلکھلاتا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ پھر نورو تیر کی سی تیزی سے اندر بھاگا اور بلو اوپر۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے قدم وہیں کھڑکی کے قریب جم گئے ہوں۔ میں لاشعوری طور پر کسی آواز کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک ایسی آواز جسے میں سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"شڑاپ ...... شڑاپ۔" بیگم بٹ کی چھڑی کی جانی پہچانی آواز آئی اور میں نورو کے ننھے سے وجود پر پڑنے والی چوٹ کے تصور سے کانپ کر رہ گئی۔ اسے ان خوشیوں بھرے لمحات سے لطف اندوز ہونے کی سزا مل رہی تھی جس کا اسے حق نہیں دیا گیا تھا۔

نورو ہمارے مالک مکان کا نوکر تھا۔ ایک چھ سات سال کا نوکر۔ مجھے کبھی اس بات پر یقین نہیں آتا اگر میں نورو کو کام کاج کرتے ہوئے نہ دیکھ لیتی۔ ہمارے مالک مکان نیچے کے حصے میں رہتے ہیں جبکہ اوپر والی منزل انہوں نے ہمیں کرائے پر دی ہوئی ہے۔ یونہی کبھی اپنی بالکونی سے یا چھت پر ٹہلتے ہوئے میں نیچے جھانک لیتی تو مجھے نورو ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام کرتا ہوا نظر آتا۔ کبھی وہ صحن میں لگے نلکے کے پاس ڈھیروں برتن یا کپڑے رکھ کر دھو رہا ہوتا تو کبھی فرش کی صفائی میں مصروف ہوتا۔ کبھی لان کی صفائی یا پودوں کو پانی دیتا ہوا نظر آتا تو کبھی بڑے سے برآمدے کو دھونے میں مگن ہوتا۔ میں حیرت سے سوچتی کہ نورو انسانی شکل و شباہت والا کوئی روبوٹ تو نہیں جو اتنے ڈھیر سارے کام کر لیتا ہے اور تھکتا بھی نہیں۔ میرے دل میں نورو سے ملنے اور اس کے بارے میں جاننے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ آخر ایک دن مجھے اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

نورو سے میری پہلی ملاقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ اس دن میں چھت پر اپنے گملوں میں

پانی ڈال رہی تھی کہ آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔ نورو گیلے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سا تسلہ گھسیٹتا ہوا چلا آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پہلے ٹھٹکا پھر بے نیازی سے الگنی پر کپڑے ڈالنے لگا۔ میں غور سے اسے دیکھنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مگر چہرے پر عجیب سی سختی۔ جو عام طور پر اس کی عمر کے بچوں کے چہرے پر نہیں ہوتی۔ اپنے قد سے بھی اونچی الگنی پر کپڑے ڈالنے کے لئے اسے بار بار اُچھلنا پڑ رہا تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا۔

"لاؤ میں کپڑے ڈال دوں۔" میں نے مدد کی پیشکش کی۔

"جی نہیں میں ڈال لوں گا۔" اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا۔" میں پیچھے ہٹ گئی۔ "کتنا بدتمیز لڑکا ہے۔ اب تو میں اس سے نہیں بولوں گی۔" میں نے غصے سے سوچا مگر اس کے بارے میں جاننے کا شوق غصے کے احساس پر غالب آگیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"نور الدین۔" اب کے بار اس نے شرافت سے جواب دیا۔

"نیچے والوں کے یہاں رہتے ہو۔" میں نے بے تکا سا سوال کیا۔

"ہاں۔" یہ کہہ کر اس نے خالی تسلہ اٹھایا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اینٹوں کی دیوار کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اور بہت سارے سوالات پوچھنے کی خواہش میرے دل میں رہ گئی۔

یہ تھی میری اور نورو کی ملاقات۔ اس کے بعد کئی بار میرا نورو سے ٹکراؤ ہوا۔ کبھی چھت پر، کبھی گھر سے باہر۔ ہر بار میرے سوالوں کی بھرمار ہوتی اور نورو کے جوابات۔ آہستہ آہستہ نورو کی جھجھک ختم ہو گئی اور وہ مجھ سے گھل مل گیا۔ بلو سے بھی اس کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔ میری نورو سے خوب بات چیت ہوتی مگر میں ہمیشہ نورو کی باتیں سن کر افسردہ ہو جاتی۔

نور الدین نے مجھے بتایا کہ وہ بٹ صاحب کے گاؤں کا رہنے والا تھا جسے بٹ صاحب اچھے مستقبل کے سبز باغ دکھلا کر شہر لے آئے تھے۔

"باجی، میں شہر تھوڑا ہی آنا چاہتا تھا۔ وہ تو چاچے نے مجھے زبردستی بھیج دیا۔" نورو مجھے بتاتا۔ "چاچا کہتا ہے شہر میں تیرا مستقبل بن جائے گا۔"

"مگر یہاں تو تم نوکروں کی طرح کام کرتے ہو۔ بھلا بغیر پڑھے لکھے اور کوئی ہنر سیکھے تمہارا مستقبل کیسے بن سکتا ہے؟" میں حیرت سے پوچھتی۔

ایک دن وہ بہت محتاط لہجے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "باجی یہ بٹ صاحب ہیں نا..... یہ بہت چالاک ہیں۔"

"وہ کیسے بھئی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ میرے بھائی شیرے کو بھی شہر لے آئے ہیں۔ وہ بٹ صاحب کے رشتہ دار کے گھر کام کرتا ہے۔"

"تو کیا تمہارے گھر والوں کو نہیں معلوم کہ تم لوگ یہاں پر کام کرتے ہو۔"

"ہاں! ماں کو تو معلوم ہے پر وہ سمجھتی ہے ہم یہاں پڑھتے بھی ہیں وہ کہتی ہے پڑھنے کے واسطے محنت ضرور کرنا چاہئے۔"

"اور تمہارے ابّا.....؟"

"وہ تو جی پچھلے سال فوت ہو گیا تھا۔ ہم تو چاچے کے ساتھ گاؤں میں رہتے ہیں۔" اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

"تمہاری ماں کو معلوم ہے کہ بیگم صاحبہ تمہیں اتنا مارتی ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ پھر ماں دُکھی ہو جاتی نا۔" نورو معصوم لہجے میں کہتا اور میں تاسف سے سر ہلا کر رہ جاتی۔

"کئی دن گزر گئے۔ نورو یونہی مار کھاتا اور کام کرتا رہتا۔ میرا دل چاہتا کہ میں بلو کے ساتھ ساتھ نورو کو بھی پڑھاؤں مگر بیگم بٹ کے خوف سے ایسا نہیں کر پاتی کیونکہ نورو ان کا نوکر تھا تو ہم ان کے کرائے دار۔ میں بلو کو کھیلتے کودتے پڑھتے لکھتے اور زندگی کی دوسری آسائشوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھتی تو معاشرے میں پائے جانے والے اس تضاد پر میرا دل بھر آتا۔

جمعے کی صبح میں بلو کے ساتھ لوڈو کھیل رہی تھی۔ بلو بہت بے ایمانی کر رہا تھا۔ اپنی ہر باری پر وہ زیادہ خانے گنتا اور میں زچ ہو کر رہ جاتی۔

"بلو کے بچے! ..... تم بہت بے ایمانی کر رہے ہو۔ جاؤ میں نہیں کھیل رہی۔" آخر کار میں نے تنگ آ کر کہا۔

"کہاں باجی! آپ کو تو نظر بھی نہیں آتا۔ یہ دیکھئے۔" اس نے دوبارہ گنتے ہوئے تیزی سے گوٹ بڑھائی۔

"دیکھو! دیکھو! پھر!" میں نے بلو کے ہاتھ پر مارا۔ اچانک نیچے والی منزل سے برتنوں کے گرنے کی آواز آئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے بہت سارے شیشے کے برتن زمین پر مارے ہوں۔

"ارے بد بخت یہ کیا کیا!" بیگم بٹ کی چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ پھر دھمکیاں اور گالیاں۔ مگر اب اس آواز میں بٹ صاحب کی آواز بھی شامل ہو چکی تھی۔

"باجی آج پھر نورو کی شامت آئی ہے۔" بلو کی بات پر میں خاموش رہی۔ دوپہر کے وقت نورو خلافِ معمول چھت پر نہیں تھا۔ ایک یہی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی مالکوں سے نظریں بچا کر ہمارے پاس آتا تھا۔ شام ہوئی اور پھر رات مگر نورو کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں اور بلو پریشان تھے کہ نورو خیریت سے بھی ہے کہ نہیں۔ بس نہیں چلتا تھا کہ جادو سے چھوٹی سی مکھی بن جاؤں اور سب سے چھپ کر اپنے ننھے دوست کا حال دیکھ آؤں۔ رات بھر بیگم بٹ کا خوفناک چہرہ خواب میں آ کر ڈراتا رہا۔

جس بچے پر ہر وقت غصہ اتارا جاتا ہے، وہ لڑائی پسند ہو جاتا ہے۔

جس بچے سے ہر وقت شفقت برتی جاتی ہے، وہ محبت کرنا سیکھتا ہے۔

جس بچے کی تربیت علمی ماحول میں ہوتی ہے، وہ ذہانت سیکھتا ہے۔

دوسرے دن جب کالج جانے کے لئے میں اتری تو نورو کو ٹھیک ٹھاک حلیے میں لان کے پاس کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کپڑوں کی گٹھری تھی۔ جسے وہ دائیں بائیں جھلا رہا تھا۔

"ارے نورو خیریت تو ہے؟" میں نے نورو سے پوچھنا چاہا مگر برآمدے میں بیگم بٹ کو دیکھ کر خاموش رہی۔ وہ ایک لمبے تڑنگے دیہاتی آدمی سے نہ جانے کس بات پر بحث کر رہی تھیں۔ آدمی دونوں ہاتھ جوڑے کچھ کہہ رہا تھا اور بیگم بٹ کا سر مسلسل نفی کے انداز میں ادھر ادھر ہل رہا تھا۔

میں نے نورو کو اشارہ کیا اور ہم دونوں چپکے سے باہر نکل آئے۔

"کیسی جا رہے ہو نورو؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں باجی۔ چاچے کے ساتھ گاؤں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لئے۔" نورو اطمینان سے بولا۔

میں سمجھ گئی کہ بیگم بٹ نے نورو کو نوکری سے نکال دیا ہے مگر کیوں نکالا۔ یہ بات میں اس سے پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں اس وقت بہت خوش تھے۔ بھلا خوشی کے موقع پر گزری ہوئی تلخ باتوں کا کیا ذکر۔ میں نورو سے گاؤں کی باتیں کرنے لگی۔

"تم وہاں کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"کھیتوں میں کام کروں گا، ہل چلاؤں گا، اور"

"نورو سوچ سوچ کر بتانے لگا۔

"اور پڑھو گے بھی؟"

ہاں ..... پڑھوں گا بھی۔ گاؤں میں اسکول نہیں ہوتے کیا۔" نورو اتراتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ نہ جانے کس احساس کے تحت دمک رہا تھا۔ جب قیدی رہائی پاتے ہوں گے تو ان کے چہرے پر ویسی ہی چمک ہوتی ہوگی جیسی اس وقت میں نورو کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔

"چل نورے۔" اس کے چاچا نے اسے پیچھے سے گھسیٹا تو میں نے جلدی سے اپنے بیگ سے قلم نکال کر نورو کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جب تم پڑھنے لکھنے لگو تو مجھے خط ضرور لکھنا۔"

"خدا حافظ باجی۔"

"خدا حافظ۔"

نور الدین اپنے چاچے کے ساتھ کسی شوخ و شریر بچے کی طرح جھومتا جھامتا چلا جا رہا تھا اور میرے دل سے دعا نکل رہی تھی کہ خدا کرے اسے دنیا کی وہ تمام خوشیاں نصیب ہوں جن پر اس کا اور اس جیسے تمام بچوں کا حق ہے۔

انعامی
مقابلہ
نمبر 1

MAGGI®

2-MINUTE NOODLES

آپ کی ذہانت کا امتحان!
صرف تین سوال بوجھیئے اور اپنا پسندیدہ
میگزین مفت حاصل کیجئے۔

پہلا انعام — ایک سال کے لئے انوکھی کہانیاں
دوسرا انعام — چھ ماہ کے لئے انوکھی کہانیاں
تیسرا انعام — تین ماہ کے لئے انوکھی کہانیاں

تین سے زیادہ صحیح جوابات موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جائے گا جو کہ حتمی اور ناقابلِ تنسیخ ہوگا۔

جلدی کیجئے اور کوپن پر درج سوالات کے جواب میگی نوڈلز کے دو خالی ریپرز کے ساتھ دفتر انوکھی کہانیاں ۱۵ اپریل تک روانہ کر دیجئے۔

نام: ____________ عمر: ____________
پتہ: ____________

سوالات

سوال نمبر۱ لاہور کی بادشاہی مسجد کس مغل بادشاہ کی تعمیر کردہ ہے؟
جواب: ____________
سوال نمبر۲ پاکستان کا قومی ترانہ کس نے لکھا؟
جواب: ____________
سوال نمبر۳ میگی نوڈلز کے پیک پر لفظ میگی کتنی بار لکھا ہے؟
جواب: ____________

MAGGI®
2-MINUTE NOODLES
انعامی
مقابلہ
نمبر 1

Interflow

کاش! میرے ان ہاتھوں
میں بوٹ پالش کی جگہ کاپیاں
کتابیں ہوتیں...!!!

کام جلدی ختم کرنا ہے
ورنہ استاد کی گالیاں سُننی
پڑیں گی

یہ اوزار ہی اب میرے ساتھی ہیں۔

کام کے دوران کتنی بار لکڑی کا بُرادہ میری آنکھوں میں گھس جاتا ہے۔

اُفوہ! دھوپ میں رومال بیچ بیچ کر میرا چہرہ کتنا کالا ہوگیا ہے...!!

ہمارے ہاتھ خراب ہوگئے تو کیا، میز تو ٹھیک اٹھی ہے نا۔

آپ میری تصویر تو بنا رہے ہیں لیکن میرا مستقبل کون بنائے گا؟

روشن چہرے تاریک مستقبل

شیخ تاج محمد

حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ بچوں کو ایسے کاموں سے بچائے جن سے ان کی صحت، تعلیم یا ذہنی و جسمانی ترقی میں رکاوٹ پڑ سکتی ہو۔

ستارے آسمان پر اور جگنو اندھیروں میں چمکتے ہیں جبکہ کچھ جگنو اور کچھ ستارے حسرت و یاس کے ہوتے ہیں جو ان بچوں کی آنکھوں میں جھلملاتے ہیں جو دکانوں، کارخانوں، ہوٹلوں اور سڑکوں پر کام کرتے ہیں۔ جب یہ کام کرنے والے بچے اپنے ہم عمر بچوں کو صاف ستھرے کپڑوں میں بستہ کاندھے پر لٹکائے اسکول جاتے دیکھتے ہیں تو یقیناً سوچتے ہوں گے۔

"کاش پڑھنا لکھنا ہمارا بھی حق ہوتا!! ہم بھی پڑھ لکھ سکتے، کھیل کود سکتے اور فکروں سے آزاد خوش و خرم زندگی گزار سکتے.....!!!"

خوش رہنا، پڑھنا لکھنا اور کھیلنا کودنا ہر بچے کا حق ہے لیکن بہت سے بچے اپنے اس حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے بجائے وہ محنت مزدوری کرتے ہیں اور کھیلنے کودنے کے بجائے کوئی کام سیکھتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق ہمارے ملک پاکستان میں ایک کروڑ چالیس لاکھ بچے مزدوری کرتے ہیں۔ ان میں سے اسّی لاکھ بچوں سے جبری مزدوری کرائی جاتی ہے یعنی وہ کام چھوڑ نہیں سکتے۔ ان بچوں کی عمر پانچ سے پندرہ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ ان میں لڑکیاں بھی شامل ہیں جو عام طور پر قالین بنانے کے کارخانوں میں کام کرتی ہیں یا گھروں پر جھاڑو پونچھا اور برتن دھونے جیسے کام کرتی ہیں۔

ایسی ہی ایک لڑکی ریحانہ ہے جو گزشتہ تین برس سے گھروں میں جھاڑو لگانے اور برتن دھونے کا کام کر رہی ہے۔ اس کی عمر صرف بارہ سال ہے۔ ایک گھر میں جھاڑو لگانے یا صرف برتن دھونے کے اسے صرف پچاس روپے ماہانہ ملتے ہیں۔

ریحانہ کی بڑی بہن روبینہ بھی چھوٹی عمر ہی سے گھروں میں کام کرتی تھی۔ اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔

لڑکے زیادہ تر موٹر مکینک، آٹو الیکٹرک ورکشاپ، فرنیچر، ہوٹل، سائیکل مرمت، درزی کی دکان، ریڑھی والوں یا پھر پٹرول پمپ کے سروس اسٹیشنوں پر کام کرتے ہیں۔

پانچ سے پندرہ سال کی عمر کے ان بچوں کو کہیں بھی تیس روپے روز سے زیادہ کی مزدوری نہیں ملتی۔

محمد صدیق کی عمر چودہ سال ہے۔ وہ ٹائر پنکچر

بنانے کی دکان پر کام کرتا ہے۔ شاہ فیصل کالونی میں رہنے والا یہ بچہ صبح اسکول جانے کے بجائے گاڑیوں میں دھکے کھاتا ہوا گذری کے قریب پٹرول پمپ پر واقع دکان پر پہنچ جاتا ہے اور شام پانچ بجے تک یہاں کام کرتا ہے۔ کام زیادہ ہو تو کبھی دیر تک رکنا بھی پڑتا ہے۔ اتنی دیر تک کام کرنے کا معاوضہ اسے صرف دس روپے روزانہ ملتا ہے۔ اس کے والد ریڑھی پر پھل بیچتے ہیں۔

بہت سے بچے اپنا ذاتی کام کرتے ہیں مثلاً چھولے حلیم بیچنا اور ضروریات زندگی کی چھوٹی موٹی اشیا فروخت کرنا۔ بہت سے بچے جوتے پالش کرتے ہیں یا پھر کچرا جمع کرتے ہیں۔

ایک کچرا جمع کرنے والے بچے نے بتایا کہ اسے ایک من کچرے کے پچاس روپے ملتے ہیں اور ایک من کچرا جمع کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس میں صرف وہی چیزیں شامل ہونی چاہئیں جو دوبارہ استعمال کے قابل بنائی جا سکتی ہوں مثلاً پلاسٹک، سیلوفین کی تھیلیاں، کاغذ، گتا اور ہڈی وغیرہ۔

جبری مزدوری کرنے والے بچے زیادہ تر قالین بنانے کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ ان کی کہانی بھی عجیب ہے۔ کارخانے کا مالک اپنے کارندوں کے ذریعے ایسے خاندانوں سے رابطہ کرتا ہے جو مالی مشکلات کا شکار ہوتے ہیں اور جہاں آٹھ دس برس کی عمروں کے بچے بھی ہوتے ہیں۔ کارخانے کا مالک ان بچوں کے والدین کی مجبوریاں ڈیڑھ دو ہزار روپے میں خرید لیتا ہے۔ والدین اسے اس بات کی اجازت دے دیتے ہیں کہ وہ ان کے بچوں کو کام کے لئے لے جائے۔ تین ماہ تک ایسے بچوں سے بغیر کسی معاوضے کے کام کرایا جاتا ہے گویا بے گار لی جاتی ہے۔ تین ماہ بعد ان کو سو روپے ماہانہ کے حساب سے مزدوری دی جاتی ہے۔ پہلے مہینے کی کارکردگی اطمینان بخش ہو تو رقم بڑھا کر ایک سو پچاس روپے کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً مزدوری کی رقم بڑھائی جاتی ہے لیکن یہ کسی بھی حال میں ایک ہزار روپے ماہانہ سے زیادہ بڑھ نہیں پاتی۔

ہمارے ملک میں چار سے چودہ برس کی عمر کے درمیان پچاس ہزار بچے قالین بافی کی صنعتوں میں کام کر رہے ہیں۔ سندھ کے ضلع تھرپارکر میں آٹھ سو کھڈیاں ہیں جن کے دس مالک ہیں۔ ان کھڈیوں پر تین ہزار دو سو مزدور کام کرتے ہیں جن میں سترہ سو بچے بشمول لڑکیاں ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق پڑوسی ملک بھارت میں تقریباً تین لاکھ بچے قالین بافی کی صنعتوں میں جبری مشقت کر رہے ہیں۔ یہ صنعتیں زیادہ تر بہار اور اترپردیش کے صوبوں میں ہیں۔

ایک تیرہ سالہ بچے "ودیانند رام" نے خبر رساں ادارے "رائٹر" کے نمائندے کو بتایا کہ قالین بافی کے کارخانے کا مالک اس کو اور اس کے نو

سالہ بھائی کو چار برس پہلے لے گیا تھا اور اس کے بدلے ان کے والد کو صرف ایک ہزار روپے دیئے تھے۔ "ودیانند" نے بتایا کہ کارخانے میں وہ صبح سے رات تک کام کرتے ہیں۔ ان کو مزدوری ملتی ہے نہ چھٹی۔ کھانے میں روٹی اور نمک ملتا ہے۔ کارخانے میں اگر کوئی کام نہیں کرتا تو اس کی پٹائی ہوتی ہے۔ کام کرنے والے بچّے گھر نہیں جا سکتے اور رات کو کارخانے ہی میں چٹائیوں پر سوتے ہیں۔

بچّوں سے مشقت لینے کا سلسلہ روکنے کے لئے پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور قانون بنائے گئے ہیں۔ اب تک جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) قانون برائے اطفال (مزدوری) ۱۹۳۳ء
(۲) فیکٹریز ایکٹ۔ مجریہ ۱۹۳۴ء۔ (۳) بچوں کی ملازمت کا قانون مجریہ ۱۹۳۸ء (۴) مغربی پاکستان کا قانون برائے دکان و تنصیبات۔ ۱۹۶۹ء

جب کہ پچھلے برس دو قوانین مزید نافذ کئے گئے ہیں جن میں پہلا "بچّوں کی ملازمت کا قانون مجریہ ۱۹۹۲ء" اور دوسرا "جبری مشقّت کے خاتمے کا قانون مجریہ ۱۹۹۲ء شامل ہے لیکن افسوس ناک صورتحال یہ ہے کہ ان قوانین پر کہیں پر بھی عمل در آمد نہیں کیا جارہا۔

چھوٹے چھوٹے بچّے کھیلنے کودنے اور پڑھنے لکھنے کے حق سے محروم ہیں۔ ان کے سرپرست، بچّوں کے بڑے بڑے ادارے اور خود حکومت بچّوں کے حقوق اور ان کے مسائل میں دلچسپی نہیں رکھتی۔

یہ چھوٹے چھوٹے بچّے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دنیا روشن کرتے ہیں لیکن خود ان کی "خوبصورت دنیا" تاریک نظر آتی ہے۔

سائنسی اندازے کی بدولت

کولمبس کو باہر نکلنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنی جنتری سے یہ معلوم کر لیا کرتا تھا کہ چاند گرہن کب ہو گا۔ ایک مرتبہ اس کی جنتری نے اس کی جان بچا دی ہوایوں کہ ۱۵۰۴ء میں اسے جزیرہ جمیکا میں کئی ہفتے رہنا پڑ گیا۔ وہاں کے باشندے اس کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے اسے کھانے پینے کی چیزیں دینے سے انکار کر دیا۔ خوش قسمتی سے چاند گرہن قریب تھا۔ کولمبس نے لوگوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اسے کھانا نہ دیا تو وہ چاند کو چھپا دے گا۔ اور ان کی راتیں اندھیری ہو جائیں گی۔ جزیرے کے باشندوں کو خبر نہ تھی کہ کولمبس کے پاس جنتری موجود ہے۔ جب ۲۹ فروری کو چاند گرہن ہوا تو وہ لوگ بڑے گھبرائے۔ انہوں نے کولمبس کو کھانے پینے کی چیزیں دیں اور اس کے سامنے ہاتھ پیر جوڑے کہ خدا کے لئے ہمیں ہماری چاندنی واپس دے دو۔ یوں کولمبس کو نجات ملی۔

صائمہ عنبرین۔ جھمرہ سٹی

رمضان اور عید

شمع انعام

یہ عید کا سماں ہے، رستے مہک رہے ہیں
پی پی کے شیر خرما بچے چہک رہے ہیں
مہکی ہوئی فضا میں چہرے دمک رہے ہیں
پیالے مسرتوں کے ہر سو چھلک رہے ہیں
یہ عید اور خوشیاں رمضان سے ملی ہیں
خوش ذائقہ سویاں رمضان سے ملی ہیں

کپڑے نئے پہن کر سب مسکرا رہے ہیں
خوشبو لگا رہے ہیں، پکوان کھا رہے ہیں
سینے سے لگ کے اپنے شکوے مٹا رہے ہیں
بچے مزے مزے سے عیدی لٹا رہے ہیں
رنج والم دلوں سے رمضان نے مٹائے
دنیا کے اس چمن میں خوشیوں کے گل کھلائے

چاروں طرف ہیں کیسی مہکی ہوئی فضائیں
جوتے نئے پہن کر اب عید گاہ جائیں
خوشیاں برس رہی ہیں ڈالی جدھر نگاہیں
دیکھو وہ بھر گئی ہیں لوگوں سے عید گاہیں
پیاری سی عید دے کر اب جا چکا ہے رمضاں
نیکی کا درس دے کر رخصت ہوا ہے رمضاں

ایسے بھی لوگ ہیں جو ٹھیلہ لگا رہے ہیں
میلے ہیں ان کے کپڑے، میلہ لگا رہے ہیں
دنیا سجا رہے ہیں، رونق بڑھا رہے ہیں
آنسو چھپا رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
صبر و رضا کی دولت رمضان سے ملی ہے
اور آخرت میں جنت رمضان سے ملی ہے

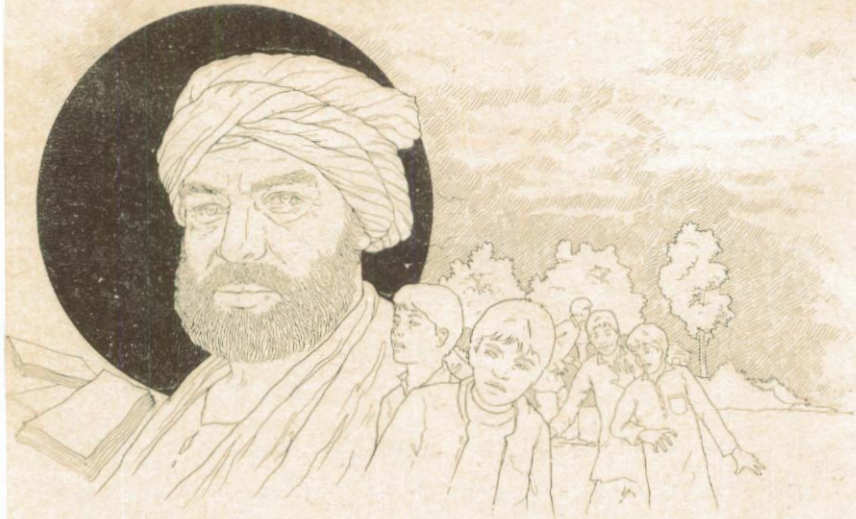

زندہ بھوت

ذیشان بن صفدر

بچوں کا یہ حق ہے کہ انہیں تفریح اور کھیل کا موقع ملنا چاہئے۔

پہلے خبر اڑی کہ کاکا شبراتی کا انتقال ہو گیا۔ شام ہوتے ہوتے سارے گاؤں میں یہ خبر عام ہو گئی۔ ان کے آخری سفر کی تیاری کے لئے چوہدری بشیر نے اپنی دکان بند کر دی۔ انہیں کاکا شبراتی کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ پہنچا تھا۔ برسوں سے کاکا ان کی دکان پر کام کرتے چلے آ رہے تھے۔ یوں ان کے آخری سفر کی ذمہ داری ان کو ہی تو سنبھالنی تھی۔ کاکا کا تھا ہی کون؟ ایک بیٹا تھا جو وطن کی حفاظت کرتے ہوئے وطن کی راہ میں شہید ہو چکا تھا۔ وہ شہید نہ ہوتا تو اسی سال اس کی شادی ہو جاتی، سب کچھ ہی تو طے ہو چکا تھا۔

گاؤں کے بچوں کو پتہ چلا کہ شبراتی کاکا، جنہیں وہ "زندہ بھوت" کہہ کر چڑایا کرتے تھے، کا انتقال ہو گیا ہے تو حیرت سے ان کو منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کیوں مر گئے وہ..... کل شام جب وہ سب مل کر انہیں زندہ بھوت کہہ کر چڑا رہے تھے تو اچھے خاصے لگ رہے تھے، بالکل ٹھیک ٹھاک..... کوئی بیماری شیماری بھی نہیں تھی انہیں۔ پھر کیوں

مرگئے..... وہ سب کاکا کو تنگ کرتے تھے اور کبھی کبھی تو بہت ہی زیادہ تنگ کر لیا کرتے تھے۔ اسی لئے گھبرا کر تو نہیں مرگئے وہ..... یہی سب سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے سارے بچے۔ گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود سب چوری چھپے ان کا آخری دیدار کرنے کاکا کے گھر بھی پہنچ گئے تھے۔

پہلی بار کاکا شبراتی کو زندہ بھوت کہہ کر کس نے چڑایا ہو گا یہ تو کسی کو بھی معلوم نہ تھا مگر یہ ضرور ہے کہ زندہ بھوت کہہ کر چڑانے کا یہ سلسلہ مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ صبح سویرے اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لئے کاکا گھر سے نکلے نہیں کہ لڑکوں نے پیچھا لے لیا۔ "زندہ بھوت"، "زندہ بھوت" کی گردان کرتے بھاگنے لگتے..... جیسے ان کا یہ پسندیدہ مشغلہ ہو۔ ادھر کاکا دانت پیستے، ہاتھ میں پتھر اٹھا کر بچوں کو دھمکاتے۔ چوہدری کی دکان تک پہنچ جاتے۔ مگر آوازیں ان کا پیچھا کرنا پھر بھی نہ چھوڑتیں..... کاکا غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے..... کوئی پوچھتا..... کاکا..... یہ ہاتھ میں پتھر کیوں اٹھا رکھا ہے۔؟ جواب ملتا، "ارے دیکھتے نہیں گاؤں کے لڑکے کتنے شریر اور بدتمیز ہیں۔ بزرگوں کے منہ آتے ہیں۔ زندہ بھوت زندہ بھوت کہہ کر چھیڑتے ہیں مجھے۔ میں ان کے دادا کی عمر کا ہوں۔ ان کے برابر کا تو نہیں..... سب کے سب پٹنے کے قابل ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ آجائے تو چھٹی کا دودھ یاد کرا دوں گا اسے۔"

"ارے چھوڑیں کاکا..... بچے ہیں، نادان اور ناسمجھ ہیں.....۔"

کاکا پھر کر کہتے، "ہاں بچے ہیں مگر انسان کے نہیں شیطان کے بچے، بُری طرح پٹنے کے لائق۔"

کبھی کبھی ایسا ہوتا، کاکا گھر سے نکلتے، چاروں طرف نظر دوڑاتے، کوئی شیطان تو نہیں ہے.....؟ سکون کا سانس لے کر چند ہی قدم کا فاصلہ طے کرتے کہ آواز کانوں سے ٹکراتی..... "اوئے زندہ بھوت..... اوئے زندہ بھوت"۔ کاکا کو غصہ آ جاتا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے، آواز کس طرف سے آئی ہے۔ سمت کا اندازہ لگاتے مگر سمجھ میں نہ آتا کہ آواز کس طرف سے آئی ہے۔

کبھی کسی گلی سے کوئی دیکھتا تو سرگوشی کے انداز میں بڑبڑانے لگتا مرگئے..... کاکا تو اسی طرف آرہے ہیں۔ "جل جلال تو..... آئی بلا کو ٹال تو" کا زیرِ لب ورد کرنے لگتا..... اور بالکل معصوم سیدھا سادا، بھولا بھالا بن جاتا..... گردن خم ہو جاتی۔ کاکا سوچتے اس نے ذرا بھی کچھ کہا تو دھنک کر رکھ دیں گے اسے..... وہ قریب سے گزرتے تو کاکا سلام کی آواز سنائی دیتی۔ "جیتے رہو بیٹا" کہہ کر کاکا آگے بڑھ جاتے، مگر جیسے ہی وہ چند قدم آگے بڑھتے تو وہی لڑکا زندہ بھوت کا نعرہ لگا کر مخالف سمت میں بھاگ کھڑا ہوتا..... اور کاکا بے چارے لکیر پیٹتے ہی رہ جاتے۔

یہ بات بھی کسی کی سمجھ میں نہ آسکی کہ لڑکے کاکا کو "زندہ بھوت" کیوں کہتے تھے..... کاکا نہ تو

بد صورت تھے۔ نہ ہی بد مزاج ...... سرخ و سفید رنگ، چوڑی پیشانی، سیدھا لانبا قد۔ گاؤں میں جب بھی کسی کے یہاں کوئی تقریب ہوتی تو انتظامی امور میں کاکا بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور کبھی کسی سے کوئی معاوضہ طلب نہ کرتے۔ کوئی دینا بھی چاہتا تو صاف انکار کر دیتے۔ "بھائی! تم لوگ میرے اپنے ہو...... اپنے گھر کے کام کا بھی کوئی معاوضہ لیتا ہے، چھی...... چھی...... چھی کتنی بُری بات ہے یہ۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" کاکا کو ان لوگوں کے یہاں بھی ہنسی خوشی کام کرتے دیکھا گیا جن گھروں کے بچے انہیں زندہ بھوت کہہ کر چڑانے میں آگے آگے ہوتے۔

بچے چڑاتے تھے، کاکا چڑتے تھے۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے جاری تھا۔

کاکا پکڑ بھی لیتے تھے کبھی کسی بچے کو، مگر جیسے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی، "کاکا معاف کر دیں، آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا" تو کاکا اسے فوراً معاف کر کے چھوڑ دیتے۔ ہاں اتنا ضرور کہتے، "اس بار تو معاف کر دیا مگر آئندہ ایسی حرکت کی تو معافی نہیں ملے گی، دونوں کانوں کے بیچ میں سر کر دوں گا۔"

بس صرف دھمکی ہی دھمکی ہوتی تھی۔ آج تک انہوں نے کسی کو بھی نہیں مارا، کسی کو کوئی سزا نہیں دی...... بڑے ہی عجیب تھے وہ...... کبھی کبھی بچوں کو مٹھائی، کچا گڑ وغیرہ بھی کھلاتے نظر آتے ...... اور مٹھائی کھا کر بچہ ہنستے ہوئے اپنے ساتھی سے کہتا، "واہ، واہ کاکا زندہ بھوت کتنے اچھے ہیں۔ میں نے کل ہی انہیں زندہ بھوت کہا اور آج مجھے انہوں نے مٹھائی کھانے کو دی۔"

عصر کے بعد گاؤں کے باہر قبرستان میں ان کو دفنا دیا گیا...... گاؤں کا کون سا شخص تھا جو ان کے جنازے میں شریک نہ ہوا ہو، جس نے آگے بڑھ کر ان کی میت کو کاندھا نہ دیا ہو، سب کو ہی ان کی وفات کا صدمہ تھا...... شہید بیٹے کا باپ ہونے کے حوالے سے اخبار تک میں ان کی موت کی خبر چھپ گئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ معمول کے مطابق ہو گیا۔ بچوں کو البتہ بُرا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ کاکا کی موت سے ...... ان کا ایک دلچسپ اور من پسند مشغلہ جو ختم ہو گیا تھا...... وہ اب اکثر سر جوڑ کر بیٹھے یہ سوچتے نظر آتے کہ اب کس کی اور کیا چڑ نکالی جائے۔

پھر ایک دن شہر سے ایک وکیل صاحب آئے۔ چوہدری صاحب سے ملے اور بتایا کہ کاکا ان کے دور کے رشتے دار تھے اور مرنے سے کافی پہلے ان کے پاس ایک وصیت رجسٹرڈ کرا گئے۔

"وصیّت ...... کیسی وصیّت؟" ...... چوہدری صاحب نے چونک کر حیرانی سے پوچھا۔

وکیل صاحب نے کہا۔ "کاکا شبراتی کو ان کے بیٹے کی شہادت کے بعد حکومت کی طرف سے ایک پلاٹ ملا تھا۔ فوجی خدمات کے صلے میں کافی نقد رقم ملی تھی جو ایک بینک میں جمع تھی۔ پلاٹ اسی

گاؤں میں ہے ...... ان کی وصیت یہ ہے کہ اس پلاٹ پر بینک میں جمع رقم کی مدد سے گاؤں کے بچّوں کے لئے ایک خوب صورت پارک تعمیر کر دیا جائے ...... جہاں وہ آزادی سے اپنی شرارتیں کر سکیں، کھیل کود سکیں اور یوں انہیں ان کے بچپن کا حق مل جائے ...... میں اسی سلسلے میں یہاں آیا ہوں ...... اب کاکا مرحوم کی آخری خواہش پوری کرنا آپ کی اور گاؤں والوں کی ذمہ داری ہے۔"

چوہدری صاحب نے بڑی فراخدلی سے یہ ذمّہ داری قبول کر لی۔ انہوں نے وکیل صاحب کو یہ یقین دہانی بھی کرا دی کہ پارک کی تعمیر میں جو رقم کم پڑے گی اسے وہ اپنے پاس سے ملا کر پوری کر دیں گے۔

پھر چوہدری صاحب کی نگرانی میں پارک کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ بچّوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت حیران ہوئے۔ جسے وہ ساری زندگی زندہ بھوت کہہ کر چڑاتے رہے، اسے ان کے حقوق کا کس قدر خیال تھا۔ وہ ان کے بچپن کے اس حق کے لئے ان کی تربیت اور تفریح کے لئے اپنی ساری جمع پونجی بھی دے گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والا انمول تحفہ۔ ایسا تحفہ جو ان کے بعد آنے والے بچّوں کے لئے بھی کام آئے گا۔ کتنا عظیم تھا وہ زندہ بھوت ...... اور اب وہ سوچ رہے تھے کہ کاکا مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ واقعی وہ زندہ بھوت ہیں، بھوت نہیں عظیم انسان، ایسے انسان جو اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیتے ہیں، یوں مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور بچّوں نے اس پارک کا نام "کاکا پارک" رکھ دیا۔

انوکھی سزائیں

○ برطانیہ میں بچّوں کی عدالت کے لئے مجسٹریٹ نے بارہ برس کی عمر کے دو بچّوں کو یہ سزا سنائی کہ وہ ان سارے پرندوں کے نام یاد کریں جن کا شکار منع ہے۔ ان بچّوں پر الزام تھا کہ انہوں نے ائیر گن سے ان پرندوں کا شکار کیا تھا۔

○ تقریباً اسی عمر کے دو امریکی بچّے چھ مہینے اسکول سے غائب رہے۔ جج نے انہیں سزا سنائی کہ وہ اپنی چھٹیاں اسکول میں گزاریں۔

○ مغربی جرمنی کے دو لڑکوں نے موٹر سائیکل چرائی۔ جج نے انہیں سزا دی کہ وہ رہا شدہ قیدیوں کے لئے پورے ایک سال تک ایک اخلاقی رسالے کا چندہ ادا کریں۔

○ آسٹریلیا کے مجسٹریٹ نے ایک ڈرائیور کو یہ سزا سنائی کہ وہ چھے مہینے تک ہر شام کو ہسپتال جائے اور وہاں ٹریفک کے حادثات میں زخمی ہونے والے لوگوں کی مرہم پٹی کرے۔

○ ایک خاتون نے کیلیفورنیا میں شربت پینے کے بعد چلتی کار سے خالی ڈبا اس بے احتیاطی سے باہر پھینکا کہ ایک موٹر سائیکل سوار پولیس والے نے بڑی مشکل سے جان بچائی، ورنہ اس ڈبے کی وجہ سے وہ حادثے کا شکار ہو جاتا۔ جج نے اس خاتون کو سزا دی کہ سڑک پر پورے ایک میل تک بکھرے ہوئے ڈبے جمع کرے۔

مرسلہ ...... عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ

معصوم بیٹے کو باپ نے جلتے چولہے پر اُلٹا لٹکا دیا

لاہور (کرائمز رپورٹر) پیلی کوٹھی شاہدرہ ٹاؤن میں گزشتہ روز ایک ظالم شخص نے میکے سے پیسے نہ لانے پر اپنی بیوی اور ساس پر تیل چھڑک کر آگ لگانا چاہی تو ۵ سالہ کمسن بیٹا ماں کو بچانے کی خاطر باپ کے قدموں سے لپٹ گیا لیکن سفاک والد نے معصوم یاسر کو ٹانگوں سے پکڑا اور جلتے ہوئے چولہے پر اُلٹا لٹکا دیا جس سے اس کا خوبصورت معصوم چہرہ اور ہاتھ بری طرح جھلس گئے۔ ننھے فرشتے کی دلدوز چیخ وپکار سن کر ایک محلے دار نے دیوار پھلانگ کر ان کی مدد کی۔ ملزم نذیر احمد موقع سے فرار ہوا تو محلے داروں نے تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا اور بعد ازاں پولیس کے حوالے کر دیا۔ تفصیلات کے مطابق میو ہسپتال میں زخمی یاسر کے ماموں عبدالرزاق نے بتایا کہ انہوں نے آٹھ سال قبل اپنی بڑی بہن کی شادی نذیر احمد کے ساتھ کر دی تھی جس کے ہاں تین بچوں نے جنم لیا لیکن نذیر نے کبھی بھی اس کی بہن کو سکھ نہ دیا اور ہر وقت تشدد کرتا رہا۔ لیکن ہم پھر بھی اس کی مالی امداد کرتے، پر وہ کوئی کام نہ کرتا۔ دو روز قبل اس نے پھر ان کی بہن کو بڑی طرح مارا اور گھر سے بھاری رقم منگوائی۔ اس بات کا پتہ کرنے میری والدہ نسیم بی بی گزشتہ روز بیٹی کے گھر گئی تو ملزم نذیر نے اسے دیکھتے ہی جھگڑا شروع کر دیا اور صحن کے دروازے کو کنڈی لگاتے ہوئے کہا کہ آج وہ سب کو زندہ جلا ڈالے گا۔ عبدالرزّاق کے مطابق نذیر نے کمرے میں پڑا ہوا مٹی کے تیل کا گیلن اٹھایا اور اس کی بہن پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ ماں نے بیٹی کو بچانا چاہا تو ملزم نے اس پر بھی تیل چھڑک دیا۔ یہ منظر دیکھ کر کمسن یاسر نے ماں کو بچانے کے لئے باپ کو روکنا چاہا تو نذیر نے اس معصوم کو جلتے چولہے پر لٹکا دیا اس دوران ایک محلے دار محمد اسلم دیوار پھلانگ کر انہیں بچانے آیا تو ملزم نے اسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ دے مارا اس چیز کا موقع پا کر مٹی کے تیل میں نہائی ہوئی دونوں ماں بیٹیاں کنڈی کھول کر باہر بھاگ گئیں۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۴ مارچ ۹۳ء)

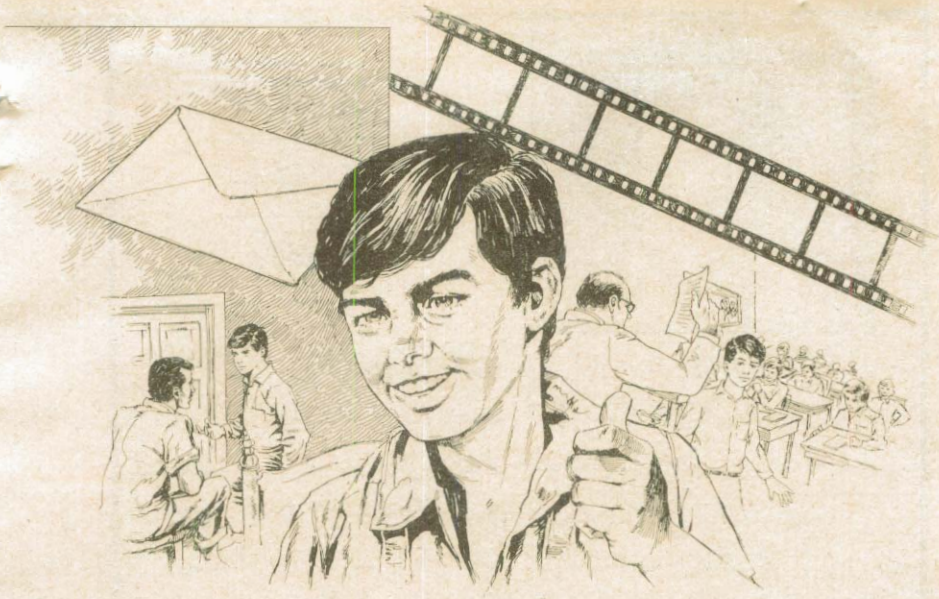

ذراسی بھول

طاہر مسعود

> کسی بچے کی ذاتی زندگی، اس کے خاندان، گھر یا ذاتی خط و کتابت میں غیر قانونی مداخلت نہیں ہونے دی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت و شہرت پہ حملہ ہونے دیا جائے گا۔

ارسلان نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن وہ کسی مجرم کی طرح اپنے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔ بلکہ مجرم بھی جرم کرنے کے بعد اتنے خوف زدہ نہیں ہوتے ہوں گے جتنا ارسلان اس وقت تھا۔ آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں اور ایک انجانا خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ آج ہیڈ ماسٹر صاحب نے آکر بھری کلاس میں اسے ذلیل کیا تھا اور ان کے جانے کے بعد لڑکوں نے اس کو گھیر کر بری طرح تنگ کیا تھا۔ دیکھا جائے تو بات اتنی بڑی نہیں تھی لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب نے بات کا بتنگڑ بنا دیا تھا۔ انہیں شروع ہی سے ارسلان سے چڑ تھی۔ چند مہینے پہلے بھی انہوں نے ایک معمولی سی بات پہ بے عزت کر کے اسے اپنے کمرے سے نکال دیا تھا۔ اس وقت اس کا قصور بس اتنا سا تھا کہ وہ اپنے شناختی کارڈ پہ جو تصویر چسپاں کر کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے دستخط کرانے لے گیا تھا، اس

تصویر میں وہ ٹائی اور کوٹ میں ملبوس تھا۔ تصویر پہ نظر پڑتے ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہونٹوں پہ حقارت آمیز مسکراہٹ ابھری اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ "بہت خوب۔ انگریز بننے کا شوق ہے آپ کو۔ فیشن سے چُور ہیں۔" انہوں نے کارڈ ہوا میں اچھال دیا۔

"مگر سر ..... !" اس نے کپکپا کر کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں۔ کارڈ پہ دوسری تصویر لگا کر لاؤ۔ کیا سمجھے!" انہوں نے سختی سے کہا۔ اس نے جھک کر اپنا شناختی کارڈ اٹھایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل آیا۔ اور سارا دن سوچتا رہا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایسا کیوں کیا۔ ٹائی لگانے اور کوٹ پہن کر تصویر کھنچوانے میں کیا بُرائی تھی۔ اور اگر اس میں کچھ ایسا تھا بھی تو وہ سلیقے سے اسے سمجھا سکتے تھے۔ اس طرح بے عزّت کرنے کا انہیں کیا حق تھا۔ کئی روز تک یہ سوالات اس کے ذہن میں گونجتے رہے لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ اس واقعے کو بھول گیا۔ لیکن آج تو انہوں نے حد ہی کر دی تھی۔

صبح سویرے تیار ہو کر وہ کتنا خوش خوش اسکول گیا تھا۔ اردو کے سر نے ایک مشکل شعر کی تشریح پوچھی تو اس نے کھڑے ہو کر جو تشریح کی، اس پر سر نے اسے بہت شاباشی دی۔ وہ تھا بھی ذہین اور کورس کے علاوہ بھی کتابیں پڑھنے والا لڑکا۔ اسی لئے اسکول کے سارے ٹیچر اسے پسند کرتے تھے۔

لیکن تیسرے گھنٹے میں جب حساب کے سر پڑھا رہے تھے کہ اچانک دروازے پہ ہیڈ ماسٹر صاحب نمودار ہوئے۔ ان کے تیور اچھے نہیں تھے۔ سارے لڑکے ادب سے کھڑے ہو گئے۔

"ارسلان احمد کون ہے؟" انہوں نے با آواز بلند پوچھا۔ حالانکہ وہ ارسلان کو خوب اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ارسلان کو ایک لمحے کے لئے اچنبھا سا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اس کی تلاش کیوں ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر تیزی سے اسے خیال آیا کہ ضرور کوئی اچھی خبر ہوگی۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یس سر!"

"اچھا تو آپ ہیں ارسلان احمد!" ان کا جانا پہچانا حقارت آمیز لہجہ سن کر ارسلان کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بولا کچھ نہیں۔ البتہ اس کا سر ذرا سا جھک گیا۔

"ارسلان! آپ نے کسی کو خط لکھا تھا؟" اب کے ان کی آواز دھیمی تھی۔

"جی نہیں ..... جی نہیں تو!" اس نے کہا

"اچھی طرح سوچ لیجئے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہونٹوں پر بڑی پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔

"جی میں نے اپنے انکل کو خط لکھا تھا۔ پچھلے پیر کو" ارسلان نے کہا لیکن اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اب کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ بہت بُرا۔

"یہ پوسٹ کارڈ تمہارا ہی لکھا ہوا ہے۔" ہیڈ

ماسٹر صاحب کا لب و لہجہ ہی بدل گیا۔ ''غور سے دیکھو۔ یہ تمہاری ہی ہینڈ رائٹنگ ہے نا!''

ارسلان نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لیکن اسے غور کرنے اور اپنی ہینڈ رائٹنگ پہچاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے سب کچھ یاد آگیا تھا۔ اور اب اس کے ذہن میں صرف دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ پورا بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی ارسلان! فلم ایکٹرسوں کو خط لکھتے ہو۔ اپنی عمر دیکھی ہے تم نے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تم ایک شریف باپ کے بیٹے ہو۔ میں آج ہی تمہارے والد صاحب سے بات کروں گا!''

ارسلان کو کچھ یاد نہیں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کیا کچھ بولتے گئے۔ اسے یاد تھا تو صرف اتنا کہ کلاس روم کی کھڑکیوں سے دوسری جماعتوں کے لڑکوں کے چہرے جھانک رہے تھے۔ یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اس واقعے کا تذکرہ دوسری کلاسوں میں پہلے ہی کر چکے تھے اور جب ان کا رخ ارسلان کی کلاس کی جانب ہوا تو تماشا دیکھنے سارے لڑکے پیچھے پیچھے چلے آئے تھے اور اب دروازے اور کھڑکیوں سے تانک جھانک کر رہے تھے۔

ارسلان احمد کسی مجرم کی طرح کلاس روم میں سر جھکائے کھڑا تھا اور پوری کلاس نہایت دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے چاروں طرف کوئی بھی اس کا ہمدرد نہیں ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کی درمیان کھڑا ہے۔ ان دشمنوں کے درمیان جو نہ جانے کب سے اسے ذلیل ہوتا دیکھنے کے منتظر تھے اور آخر کار وہ منحوس دن آگیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد حساب کے سر نے بھی اپنا بستہ اٹھایا اور کلاس روم سے نکل گئے اور پھر لڑکوں نے اسے گھیر لیا۔ کتنے گھٹیا اور گرے ہوئے فقرے انہوں نے استعمال کئے تھے اور کس کس طرح سے اس سے پوچھا تھا کہ ہاں بھئی بتاؤ تو سہی تم نے فلم ایکٹرس کو لکھا کیا تھا۔ جب وہ کلاس روم سے اپنا بیگ اٹھا کے بھاری قدموں سے باہر نکلا تو لڑکوں کی ٹولی اس کے پیچھے تھی۔ وہ چیخ رہے تھے، سیٹیاں بجا رہے تھے، تالیاں پیٹ رہے تھے۔ اس نے کئی بار چاہا کہ دوڑ لے۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے اسکول سے کہیں دور نکل جائے۔ اتنی دور جہاں ہیڈ ماسٹر صاحب اور ان لڑکوں کی پرچھائیں بھی نہ پڑ سکے لیکن اس کی ٹانگیں بوجھل ہو گئی تھی۔ وہ چل نہیں رہا تھا، اپنے آپ کو آگے کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور خود کو بستر پہ گرا دیا۔ اس کا سارا بدن تپ رہا تھا اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی خیال آرہا تھا کہ اب وہ اسکول کس طرح جائے گا۔ اپنے دوستوں اور ٹیچروں کا سامنا کس طرح کرے گا۔ ابا سُنیں گے تو اس کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں

گے، ہو سکتا ہے گھر سے نکال بھی دیں۔ تو کیوں نہ وہ اس سے پہلے ہی گھر چھوڑ دے اور کہیں بھاگ جائے۔ یہ باتیں سوچ سوچ کر وہ ہولتا رہا اور آنسو اس کے رخساروں سے ڈھلک ڈھلک کر تکیے کو بھگوتے رہے۔ تب امّی جان کی آواز آئی "ارسلان بیٹے۔ آؤ کھانا کھالو!"

کتنی شفیق تھی یہ آواز، کتنی محبت تھی اس لہجے میں۔ اس کا جی چاہا کہ بھاگ کر امّی جان سے لپٹ جائے۔ ان کی آغوش میں پناہ لے لے لیکن اس میں تو بستر سے اٹھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ وہ یونہی پڑا رہا۔ جب وہ کھانے کی میز پہ نہیں پہنچا تو دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے اُٹھ کر اپنے آنسو پونچھے اور دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے بیٹے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" امّی جان نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔ "میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"لیکن کیوں۔ صبح بھی تم نے صرف ایک توس لیا تھا۔ آخر بات کیا ہے۔ تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں۔ کیا تم روتے رہے ہو؟" امّی جان نے پریشان ہو کر ایک دم ڈھیر سارے سوالات کر دیئے۔

"کچھ بھی نہیں۔ آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے!" یہ کہہ کر وہ بستر پہ جاکر لیٹ گیا۔ امّی بہت دیر تک اس سے پوچھتی رہیں۔ لیکن اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

شام کو بھی وہ باہر نہیں نکلا۔

ایک مرتبہ اس نے اُٹھ کر کھڑکی سے دیکھا میدان میں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ اسے بے انتہا رشک آیا۔ اگر وہ حماقت نہ کرتا تو آج وہ بھی ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتا لیکن اب تو وہ ان سب کے لئے اچھوت ہو گیا تھا۔ ایک نہایت بُرا لڑکا۔ اس نے اس دن کو کوسا جب گھر والوں کے ساتھ فلم دیکھ کر واپس آنے کے بعد اس نے فلم کی ہیروئین کو خط لکھنے کا فیصلہ کیا تھا، جس نے فلم میں فلسطین کی عظیم مجاہدہ کا کردار ادا کیا تھا اور اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لئے قربانیاں دی تھیں۔ یہ فلم اس کے اعصاب پہ چھا گئی تھی اور وہ اتنا مسحور ہو گیا تھا کہ بے اختیار اس نے جوابی پوسٹ کارڈ پہ خط لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ اس نے ابّا جان کے خوف سے جوابی کارڈ پہ اسکول کا پتہ لکھ دیا تھا لیکن اس کا خط اسکول کیسے پہنچ گیا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

رات گئے ابّا جان آئے تو کھانے کی میز پہ امّی جان سے ان کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ ابّا جان کا بلاوا آگیا۔ پھر بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سب کچھ سچ سچ بتادے گا۔

"آیئے ارسلان صاحب!" ابّا جان نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کہیں سے بھی ناراض نہیں لگ رہے تھے۔ گویا ابھی انہیں کچھ

چراغِ راہ

○ ہم دوستوں کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں، ہمسایوں کے بغیر نہیں۔ (ائن)

○ اپنے ہر خیال اور ہر عمل میں شریف ہو۔ (لانگ فیلو)

○ آنسوؤں کو بہہ جانے دو، یہ غموں کو مایوسیوں میں تبدیل ہونے سے روکتے ہیں۔ (لی ہنٹ)

○ تمسخر اکثر دل شکنی قطع دوستی اور دشمنی کا سبب بن جاتا ہے۔ (امام غزالیؒ)

معلوم نہیں ہے۔ ارسلان کو ذرا سا اطمینان ہوا۔

"کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان ہیں۔" انہوں نے اس سے نرمی سے پوچھا۔ "نہیں تو۔" اس نے سر جھکا کے جواب دیا۔ ابّا جان سے نظریں ملانے کی اسے ہمّت نہ ہو سکی۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے بیٹے۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو۔ تمہارا سر جُھکا ہوا کیوں ہے۔ تم سے کوئی بُری بات نہیں ہوئی ہے بیٹے۔ میں نے تمہارا خط پڑھ لیا ہے۔ یہ خط میں خود اپنے ہاتھوں سے پوسٹ کروں گا۔"

ارسلان نے حیرت سے ابّا جان کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے کانوں پہ اعتبار نہیں آیا۔

"ہاں لیکن تم سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے۔ تمہیں پتا اسکول کے بجائے گھر کا دینا چاہئے تھا۔ کیا تمہیں ہم لوگوں پہ اعتبار نہیں ہے۔ اگر تم مجھ پہ اور اپنی امّی جان پہ بھروسہ کرتے تو آج اسکول میں جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، وہ ہر گز نہ ہوتا۔ مجھے تمہارے حساب کے ماسٹر صاحب نے آکر سب کچھ بتا دیا۔ وہ خود اس بات پہ افسردہ تھے کہ یہ سب کچھ اس طرح سے نہیں ہونا چاہئے تھا۔ تمہارے ہیڈ ماسٹر صاحب میرے بہت پرانے جاننے والے ہیں۔ انہیں میری ذات سے کچھ غلط فہمیاں ہیں جس کا انتقام وہ تم سے لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اچھّا نہیں کیا۔ میں ان سے بات کروں گا۔ اب تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ۔ شاباش!" ابّا جان چپ ہوئے تو ارسلان کو لگا کہ اس کا کھویا ہوا اعتماد واپس آگیا۔

"ابّو لیکن میرا خط واپس کیسے آگیا؟" اس نے ہمّت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"تم نے گھبراہٹ یا جلدی میں اپنا پتا اوپر کے کارڈ پہ لکھ دیا تھا۔ اس لئے خط جوں کا توں اسکول میں واپس آگیا۔ تمہارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو کسی دوسرے کا خط نہیں پڑھنا چاہئے تھا لیکن ان سے غلطی ہوئی۔ خیر کوئی بات نہیں۔"

"مجھ سے بھی غلطی ہوئی ابّو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ فلم ایکٹرسوں کو خط لکھنا بُری بات ہے۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" ارسلان نے کسی قدر شرمندگی سے کہا اور ابّا جان یہ سن کر اس طرح ہنسے جیسے وہ ارسلان سے یہی سننا چاہتے ہوں۔

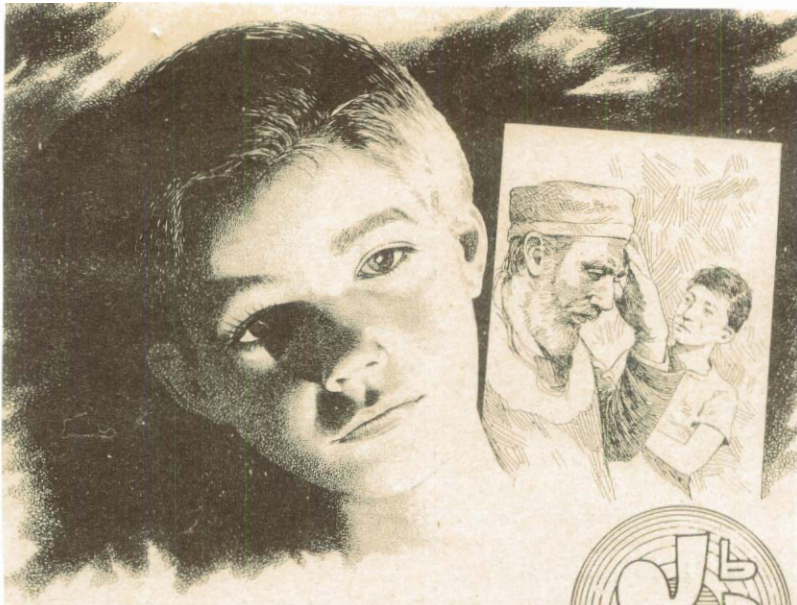

ڈبو

الف خان

یہ جاننا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں؟ ہر بچّے کا حق ہے تاکہ وہ ان کی محبت اور توجہ حاصل کر سکے۔

ڈبو "دارالامان" میں پلا بڑھا تھا۔ سب اسے ڈبو کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ نام دارالامان کے مالک حاجی زاہد نے دیا تھا۔ اس کا اصل نام تو واجد رکھا گیا تھا لیکن چونکہ وہ ڈبے کا دودھ پی کر بڑا ہوا تھا اور بہت صحت مند پیارا بچہ لگتا تھا اس لئے جب پہلی بار حاجی زاہد نے اسے دیکھا تھا تو وہ اسے بے حد پیارا لگا تھا۔ اس نے گود میں اٹھا کر اس کو پیار کیا تھا پھر کہا تھا "مُنّے میاں! تم تو بہت پیارے سے بچّے ہو۔ بالکل ہمارے ڈبو کی طرح۔"

ڈبو کی عمر دس سال کے قریب تھی۔ وہ بڑا ذہین اور پیارا بچہ تھا لیکن جوں جوں وہ بڑا ہو رہا تھا، دارالامان میں کام...... کرنے والے لوگوں کی نگاہوں میں اس کے لئے نفرت اور حقارت بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈبو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو اسے اپنا چہرہ پھول کی طرح معصوم نظر آتا۔

"میرے چہرے میں تو کوئی خرابی ہی نہیں پھر لوگ مجھے اتنی حقارت سے کیوں دیکھتے ہیں؟" ڈبو اُلجھ سا جاتا اور کبھی لوگوں کی طنزیہ نگاہوں کی تپش بڑھ جاتی تو وہ گھبرا کر دارالامان کی عمارت سے باہر نکل جاتا، باغ میں جاکر ٹہلنے لگتا۔ رنگ برنگے پھولوں پر اُڑتی ہوئی تتلیوں کو دیکھنے میں مصروف ہو

جاتا لیکن اسے کچھ بھی تو اچھا نہ لگتا۔

دارالامان میں بس دو افراد ہی اسے پیار کرتے تھے ایک دارالامان کا مالک حاجی زاہد جو بہت امیر آدمی تھا اور دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ وہ مہینے میں ایک دو بار دارالامان کے معائنے کے لئے آتا تھا جبکہ دوسرا محبّت کرنے والا بابا فضلو تھا جو دارالامان کا سب سے پرانا ملازم تھا۔

ڈبّو بابا فضلو سے مانوس تھا اور بابا فضلو بھی اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ڈبّو گھنٹوں بابا فضلو سے باتیں کرتا رہتا اور بابا فضلو بھی اس کی باتوں سے کبھی نہ تھکتا تھا۔

بابا فضلو کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا ڈبّو بہت اُداس اور خاموش رہنے لگا ہے۔ بابا کو معلوم تھا کہ وہ کیوں اداس ہے؟ جس محبت اور توجہ کی ڈبّو کو ضرورت تھی وہ اسے دارالامان کی فضا میں نہیں مل رہی تھی۔

بابا فضلو اپنے کمرے میں بیٹھا سر اوپر اٹھائے چھت کی کڑیاں گننے میں مصروف تھا مگر اس کا ذہن ڈبّو میں الجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "ڈبّو بے حد حساس بچّہ ہے۔ جوں جوں وہ بڑا ہو رہا ہے اس کا دُکھ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔" بابا کو معلوم تھا کہ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت بھی بڑھ رہی ہے۔

"یہ صلاحیت کہیں کسی دن اسے توڑ کر نہ رکھ دے۔" بابا نے دُکھ کے ساتھ سوچا۔ وہ ابھی سوچوں میں ہی مگن تھا کہ ڈبّو ہچکیوں کے ساتھ روتا ہوا کمرے میں آ گیا۔

"ارے میرا بیٹا! کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کس نے ڈانٹا ہے تجھے؟" "کسی نے نہیں؟" ڈبّو نے روتے ہوئے کہا۔

"کسی نے مارا ہے کیا؟"

"نہیں!" ڈبّو کی ہچکیاں رُک نہیں رہی تھیں۔

"اچھا تو پھر کسی نے کچھ کہا ہو گا تجھ سے؟ مجھے بتا میں ابھی اس کی خبر لیتا ہوں۔" فضلو نے غصے سے کہا۔ ڈبّو نے کچھ نہیں بتایا۔ بس روتا رہا۔ بابا نے اسے سینے سے لپٹا کر تھپکی دی۔ پیار کیا، چمکارا۔ اس سے بہت پوچھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے؟ لیکن ڈبّو نے کچھ نہیں کہا البتہ دوسرے دن بابا سے پوچھا:

"بابا! کیا ماں باپ اپنے بچّوں سے بہت پیار کرتے ہیں؟"

بابا فضلو اس کا یہ سوال سن کر چونکا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں بیٹا! بہت پیار کرتے ہیں!!!"

"نہیں بابا! آپ جھوٹ کہتے ہیں!!"

"نہیں بیٹا! میں سچ کہتا ہوں واقعی ماں باپ اپنے بچّوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔" بابا نے یقین دلانا چاہا۔

"تو پھر میرے ماں باپ مجھے کچرے پر کیوں پھینک گئے تھے؟؟؟" ڈبّو نے انتہائی کرب کے عالم میں کہا اور پھر بابا کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔!!!

"ارے! تصویر کھنچوانے کے چکر میں گریبان کے بٹن لگانا تو بھول ہی گئے۔"

چودہ سال کے شیخ احمد اچھے مستقبل کی تلاش میں پنکھا ٹھیک کرتے ہوئے۔

کبھی میں امی ابو کی گود میں سوتا تھا۔ اب تنہائی میرے ساتھ سوتی ہے۔

آج یہ کون لوگ ہماری تصویر بنانے آگئے ہیں؟

گول مٹول رحیم جنہیں امی ابو کی شفقت نہیں ملی ۔

"میرا نام اصغر ہے اور یہ میرا بھائی آصف ہے۔"

یہ تمام بچے معذور ہیں اپنے گھر سے دور ہیں ۔

اپنا گھر کے ٹیلرنگ سنٹر کے ننھے منے ہنر مندوں کا گروپ فوٹو

G30 Colorscan

راحیل دھیمے دھیمے لہجے میں اپنی دکھ بھری کہانی سنا رہے ہیں۔

نے بہت اچھی قمیض بنائی تھی۔ ہم نے ان کے کام کو سراہا، انہیں شاباشی دی اور پھر جب ہم نے ان سے سوالات کئے تو انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہمیں بتایا۔

"میرا نام آصف خان ہے۔ میں یہاں تیسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کام بھی سیکھ رہا ہوں۔ شلوار قمیص بنا لیتا ہوں۔ ہمارا تعلق پشاور سے ہے۔ میرے ابّو کا نام شیر بہادر ہے۔ امّی مر چکی ہیں۔ ابّو جیل میں ہیں۔ ہمارا کوئی رشتہ دار وغیرہ نہیں، اس لئے ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ یہاں ہمارا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہم پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیلتے بھی ہیں۔ مجھے کرائے پسند ہیں اور میں یہاں کرائے سیکھ رہا ہوں۔

"آپ کو اپنے امّی ابّو تو یاد آتے ہوں گے؟" ہمارا یہ سوال سن کر آصف خان کچھ افسردہ سے ہو گئے پھر کہنے لگے۔ "جی یاد تو آتے ہیں۔" "اچھا آپ پڑھنے لکھنے کے بعد اور یہ کام سیکھنے کے بعد مستقبل میں کیا بننا پسند کریں گے"؟ ہم نے آصف کو افسردہ دیکھ کر جلدی سے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"جی! میں ٹیلر ماسٹر بننا پسند کروں گا کیوں کہ اس کام میں مجھے مزا آتا ہے"۔

آصف خان کے بعد ہم ان کے چھوٹے بھائی اصغر خان سے ملے جن کی عمر سات سال کے قریب ہو گی۔ یہ دوسری جماعت میں پڑھتے ہیں اور ابھی شلوار بنانا سیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیں

ان بچوں کی دنیا ان بچوں کا مستقبل؟

یہ سولہویں روزے کی بات ہے۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کے حقوقِ اطفال نمبر کے لئے ہمیں انٹرویو کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور ہمیں آنکھ مچولی کے دفتر واقع پی آئی بی کالونی سے تقریباً سترہ اٹھارہ کلو میٹر دور کورنگی جانا تھا جہاں انسانوں سے محبت کرنے اور بچوں سے شفقت کرنے والے محترم مولانا عبدالستار ایدھی نے یتیم، بے سہارا، معذور، گمشدہ اور لاوارث بچوں کے رہنے کے لئے "اپنا گھر" بنایا ہے۔

ہم آنکھ مچولی کی مختصر ٹیم کے ہمراہ جس میں بچوں کے نو عمر لکھاری سید کاشان جعفری بھی شامل تھے، ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد جب "اپنا گھر" پہنچے تو وہاں کے انچارج جناب جاوید عالم صاحب سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم نے جب انھیں بتایا کہ ہم ماہنامہ آنکھ مچولی کی جانب سے بچوں کا انٹرویو لینے آئے ہیں تو وہ بڑی محبت اور بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ سب سے پہلے تو انہوں

فوٹو: نعیم عزیز محمد عمر احمد خان

عکاسی: مومن رحیم

ہر حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ایسے بچوں کی حفاظت کرے جن کا کوئی گھر بار نہیں رہا۔ حکومت ان کے لئے گھر جیسا ماحول مہیا کرے گی یا ایسے ادارے قائم کریگی جو ان بچوں کی مناسب دیکھ بھال کر سکیں۔

نے ہماری ٹیم کو پورے سینٹر کا "وزٹ" کرایا پھر وہ ہمیں مختلف بچوں کے پاس لے گئے۔

سب سے پہلے ہمیں جس سیکشن میں لے جایا گیا وہ ٹیلرنگ کا شعبہ تھا جہاں استاد کی رہنمائی میں تقریباً بیس بائیس بچے شلوار قمیص بنانا سیکھ رہے تھے۔

کچھ بچے ظہر کی نماز پڑھ کر آئے تھے۔ وہ اپنی وردی تبدیل کر رہے تھے۔ انچارج صاحب نے ہمیں بتایا کہ نماز پڑھنے، کھیلنے کودنے، کام سیکھنے اور سونے کا الگ لباس ہوتا ہے۔ بچے تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں البتہ ان کی رہنمائی اور مدد کی جاتی ہے۔ اس شعبے میں چھ سال سے لے کر چودہ پندرہ سال تک کی عمر کے بچے کام کر رہے تھے۔ چھوٹے بچے کاج بنانا سیکھ رہے تھے جب کہ بڑے بچے شلوار قمیص بنا رہے تھے۔ جاوید بھائی کی رہنمائی میں سب سے پہلے ہماری ملاقات بارہ سالہ آصف خان سے ہوئی وہ قمیص بنا رہے تھے۔ ہم نے ان کی بنائی ہوئی قمیص دیکھی۔ انہوں

بتایا کہ انہیں سیر کرنے میں مزا آتا ہے۔ کچھ دن پہلے سینٹر کی جانب سے بچوں کے ساتھ کلفٹن گئے تھے۔ وہاں رنگ برنگے جھولوں میں جھولا جھول کر انہیں بے حد مزا آیا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ ابّو یاد آتے ہیں تو انہوں نے کہا "سینٹر والے ہمیں ہر ہفتے ابّو سے ملانے جیل لے جاتے ہیں"۔ اصغر خان بھی مستقبل میں ٹیلر ماسٹر بننا چاہتے ہیں۔

اب ہم جس بچّے کی طرف متوجہ ہوئے وہ راحیل تھے۔ ہلکی سانولی رنگت والے خاصے صحت مند بچے۔ ان کا جسم بھی کچھ کھلاڑیوں جیسا لگ رہا تھا۔ ہم نے جب ان سے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ راحیل لگتا ہے کہ آپ خوب ڈٹ کر کھانا کھاتے ہیں، تو وہ شرمانے لگے۔ پھر جب ہم نے ان سے بڑے پیار کے ساتھ سوالات پوچھنا شروع کئے تو انہوں نے نہایت خود اعتمادی کے ساتھ ہمارے سوالوں کے جوابات دیئے۔ راحیل کی عمر گیارہ سال ہے۔ دوسری جماعت میں پڑھتے ہیں۔ پانچوں وقت کے نمازی ہیں۔ راحیل کی کہانی دُکھ بھری ہے۔ چار سال پہلے انہیں اپنا گھر لایا گیا تھا۔ ان کی گمشدگی سے متعلق کافی اعلانات کرائے گئے لیکن ان کے والدین کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ بے چارے راحیل کو اپنے ابو کا نام بھی معلوم نہیں لیکن وہ "اپنا گھر" میں بے حد خوش ہیں۔ ننھے منے بچّوں کے کراٹے انسٹرکٹر بھی ہیں اور خود بہترین کراٹے جانتے ہیں۔ مقابلوں میں ایک عدد شیلڈ اور ایک میڈل بھی حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصویر کراٹے کے پوز میں بنوائی۔

"میرا نام عدنان ہے۔ مجھے یہاں بہت مزا آتا ہے لیکن گھر بھی یاد آتا ہے۔" یہ تاثرات چھ سالہ عدنان کے تھے جن کی کہانی اپنا گھر کے انچارج جاوید بھائی نے سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ اس بچّے کے والد اُمّت فرید ہیروئین کے عادی ہیں۔ نشہ پورا کرنے کے چکر میں گھر کی ہر چیز بیچ دی۔ ان کا بس چلتا تو اپنے معصوم بچّے کو بھی بیچ دیتے۔ اس بچّے کی ماں اور دادی ہمارے دوسرے سینٹر واقع سہراب گوٹھ میں ہیں۔ ماں اپنے ظالم بیٹے اور بیوی اپنے ظالم شوہر کے پاس واپس جانا نہیں چاہتی۔ عدنان کی کہانی سن کر سب کو دُکھ ہوا۔ عدنان نے بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ "وہ بڑے ہو کر پائلٹ بنیں گے۔"

علی احمد سے ہماری ملاقات مدرسے میں ہوئی جہاں معلّم صادق صاحب کی نگرانی میں پچاس کے قریب بچے پڑھ رہے تھے۔ علی احمد پندرہ سال کے ہیں۔ ملتان سے ان کا تعلق ہے۔ ان کے ابو محمد احمد خان کا انتقال ہو گیا تو یہ بُری صحبت میں پڑ گئے اور چوریاں کرنے لگے۔ چھ بہن بھائی ہیں۔ بڑے بھائی نے تنگ آکر انہیں اپنا گھر میں داخل کرا دیا۔ یہاں سینٹر میں ان کی مناسب تعلیم و تربیت کی گئی اور پیار و محبّت سے سمجھایا گیا تو انہوں نے بڑی عادتیں چھوڑ دیں۔ اب بچّوں کی مسجد میں اذان دیتے ہیں اور بچّوں کے امام بھی ہیں۔ انھیں نماز

"یہ وقت سونے کا ہے لیکن ہمیں نیند نہیں آ رہی ہے۔"

بھی پڑھاتے ہیں۔ مولوی صاحب سے ساتواں پارہ پڑھ رہے ہیں۔ تیسری جماعت کے طالب علم بھی ہیں۔ بڑے ہو کر پائلٹ بننے کے خواہش مند ہیں۔ کہنے لگے۔ "عید پر جب اپنے گھر ملنے جاؤں گا تو سب لوگ مجھے اچھا بچّہ پا کر کتنے حیران ہوں گے؟"

"میرا نام شیخ احمد ہے، میری عمر چودہ سال ہے۔ امی ابو کا انتقال ہو گیا ہے۔ چھ بہنیں ہیں جن میں سے تین شادی شدہ ہیں۔ دو بہنیں ایک بہن کے پاس رہتی ہیں۔ وہ مجھے اپنے پاس نہیں رکھ سکتیں اس لئے میں یہاں چلا آیا ہوں۔" بڑے ٹھہرے اور افسردہ لہجے میں شیخ احمد نے ہمیں بتایا۔ ہم نے ان کی افسردگی دور کرنے کے لئے ان سے ڈھیروں باتیں کیں تو ان کی افسردگی کچھ دور ہوئی۔ وہ الیکٹرک وائرنگ کا کام سیکھ رہے ہیں اور مستقبل میں یہی کام کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ "انہیں ٹی وی پر کارٹون اور ڈرامہ "دشت" اچھا لگتا ہے۔"

جعفر احمد اور سردار احمد آپس میں بھائی ہیں۔ جعفر کی عمر پانچ سال ہے جب کہ ان کے بڑے بھائی سردار احمد تیرہ سال کے ہیں۔ جعفر مدرسے میں پڑھتے ہیں اور سردار تیسری جماعت میں۔ ان کی امی اور بہن بھی "اپنا گھر" واقع سہراب گوٹھ میں رہتی ہیں کیوں کہ ابو نے دوسری شادی کر لی ہے۔ چھوٹی بہن بھی امی کے پاس رہتی ہے۔ امی اور بہن سے ملنے سہراب گوٹھ سینٹر کی معرفت جاتے ہیں۔

سردار احمد مستقبل میں وائرنگ کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سے باتوں کے دوران ان کی آنکھوں میں افسردگی کے تاثرات تھے شاید

انھیں امی یاد آرہی تھیں۔

مدرسے میں ہماری ملاقات ۱۲ سال کے ایک بہت ہی پیارے بچّے سے ہوئی جس کا نام فیض محمد ہے۔ ان کی امیّ فوت ہو گئی ہیں۔ ابو نے شاید دوسری شادی کر لی ہے۔ فیض محمد غلط صحبت میں پڑ کر جیبیں کاٹنا سیکھ گئے تھے۔ ان کے ابّو نے انہیں "اپنا گھر" میں داخل کرا دیا ہے۔ کہتے ہیں "جب یہ کسی قابل ہو جائے گا تو پھر اسے لے جاؤں گا"۔ فیض محمد کی آنکھوں میں بھی اُداسی کے تاثرات تھے۔ انہوں نے ہمارے سوالات کے جوابات بڑے دھیمے لہجے میں دیئے۔ یہ تیسری جماعت میں پڑھتے ہیں۔ روزے پورے رکھتے ہیں۔ انہیں گھر بہت یاد آتا ہے۔

ہم بہت سارے گونگے بچّوں سے بھی ملے۔ سولہ سالہ نوید پیدائشی گونگا ہے۔ ایک ٹانگ سے کچھ معذور بھی ہے۔ یہ گمشدہ بچّہ ہے۔ پانچ سال پہلے سینٹر میں کسی کونسلر صاحب کی معرفت آیا تھا۔ اس کی گمشدگی سے متعلق کافی اعلانات کئے گئے لیکن ورثا کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ یہ گونگا بچّہ بہترین شلوار قمیص سی لیتا ہے اور پورے سینٹر کی صفائی کا انچارج ہے۔ اس کا نام سینٹر میں رکھا گیا ہے۔

بارہ سالہ قمر عباس کا تعلق جڑانوالہ سے ہے۔ پانچ بہن بھائی ہیں۔ گجرات سے کراچی گھومنے پھرنے آئے تھے۔ آوارہ گردی کے الزام میں پولیس نے پکڑ لیا۔ اب اپنا گھر میں ہیں۔ گھر یاد آتا ہے۔ یہ پڑھتے لکھتے نہیں۔ کچھ شرارتی ٹائپ کے ہیں۔ صحت بھی اچھی ہے۔ جڑانوالہ سے ان کے ماموں کا فون آیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ "انسان کا بچّہ" بن جائے گا تو پھر لے جائیں گے۔ ہم جب انٹرویو لینے ان کے کمرے میں پہنچے تو یہ انڈیا سے آئے ہوئے ایک مدراسی بچے کو مار رہے تھے اور وہ بچہ روتے ہوئے انگلش میں انہیں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ ہم نے اس بچے کو چمکارا، پیار کیا تب کہیں جا کر وہ چپ ہوا۔ "وائی تھائی یان تھائی" ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتا ہے۔ کالی رنگت والے پندرہ سالہ اس بچہ کو چار زبانوں تامل ناڈو، تلیگو، ملیالم اور انگلش پر عبور ہے۔ یہ بچّہ مدراس انڈیا سے ٹرین کے ذریعے گھومتا گھامتا پاکستان پہنچا اور اب اپنا گھر میں ہے۔ یان تھائی کو گھر یاد نہیں آتا کیوں کہ گھر میں اس کی پٹائی ہوتی ہے۔ اس بچّے کا تعلق تامل ناڈو سے ہے۔ سعودی عرب میں مقیم اس کے انکل سے سینٹر کا رابطہ ہوا ہے۔ جلد ہی اسے انڈیا بھجوانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ انڈین سفارت خانے کے سفارت کار مسٹر رامسوامی نے سینٹر سے وعدہ کیا ہے کہ وہ عید سے پہلے پہلے اس بچّے کو ضروری کارروائی کے بعد انڈیا بھجوا دیں گے۔

"اپنا گھر" کے ان پھول جیسے بچّوں سے انٹرویو مکمل کے بعد جب ہم واپس آرہے تھے تو ہمارے ذہن کے پردے پر ان بچّوں کی تصویریں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ ہمیں ان کی گھر والوں کی یاد

سے محروم ہیں۔

یہ بچّے بہت زیادہ شفقت، محبت اور توجہ کے محتاج ہیں۔ ان بچّوں کی دنیا ہمارے معاشرے سے الگ نہیں۔ انہیں اپنے بہتر مستقبل کے لئے ہماری بھی محبت، توجہ اور شفقت کی ضرورت ہے۔ ■

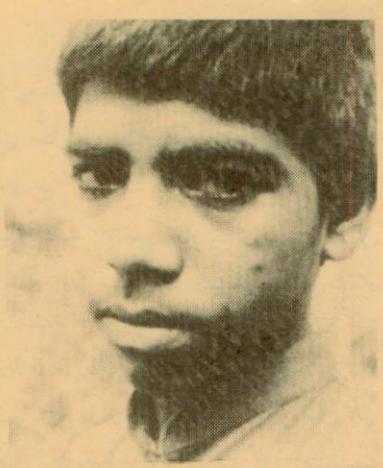

"دانی تھانی یان تھانی"، انڈیا کے شہر مدراس سے بھاگ کر آئے ہیں کیونکہ گھر میں ان کی پٹائی ہوتی تھی۔

میں کھوئی ہوئی آنکھیں، خوشی و افسردگی سے ملے جُلے احساس میں ڈوبے چہرے اور ہتے ہوئے ہاتھ نظر آرہے تھے جو انھوں نے رخصت ہوتے ہوئے ہمیں دیکھ کر ہلائے تھے۔ اپنا گھر میں ان بچّوں کو خوش و خُرّم رکھنے کے لئے چڑیا گھر اور جھولے بنائے گئے ہیں، کھیلوں کا سامان مہیا کیا گیا ہے، پڑھنے لکھنے کے لئے مدرسہ اور پرائمری اسکول ہے۔ ان کے ساتھ محبّت شفقت اور نرمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے، انہیں تفریحی مقامات پر بھی گھمایا جاتا ہے لیکن جو حقیقی خوشی بہن بھائیوں اور والدین کے درمیان حقیقی گھر میں حاصل ہوتی ہے وہ اس

مارچ ۱۹۹۳ء کے شمارے میں شائع ہونے والی "نادرہ انعام کی تحریر" قدرت کا نظام" نقل شدہ تھی۔ نادرہ انعام کو بلیک باکس کہا جاتا ہے۔ آئندہ ان کی کوئی تحریر آنکھ مچولی میں نہیں چھپے گی۔ ثبوت فراہم کرنے پر ادارہ عثمان بن سلیم، کراچی اور عدنان حیدر بخاری صادق آباد کا ممنون ہے۔ (ادارہ)

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۷۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولا بخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

وطنِ عزیز کے قریے قریے

اور نگر نگر

ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

ان اداروں

کو اپنا باقاعدہ

ایجنٹ

مقرر کیا

ہے

آنکھ مچولی

خریدنے کے لیے

اپنی تجاویز اور مشوروں کیلئے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط وکتابت کے لیے — ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

عجب دن تھے وہ بچپن کے

حفیظ الرحمٰن احسن

وہ دن کیا دن تھے بچپن کے   کہ ہم تھے پھول گلشن کے
بہت چھوٹے تھے، کم سن تھے   .... عجب دن تھے!
نہ کوئی فکر تھی ہم کو   سمجھتے تھے نہ ہم غم کو
وہ ہنسنا ہر گھڑی اپنا   یہ بچپن تھا عجب سپنا
جو ہم اسکول جاتے تھے   جو ہم پڑھ لکھ کے آتے تھے
تو خوش ماں باپ ہوتے تھے   فدا ہم پر تھے تن من سے
وہ دن کیا دن تھے بچپن کے
.... عجب دن تھے!

وہ ساتھی اپنے بچپن کے سبھی نیارے تھے، پیارے تھے
وہ ہنسنے اور ہنسانے کے زمانے کیا سہانے تھے!
بہت رنگیں فضائیں تھیں بہاریں ہی بہاریں تھیں
تھے سب منظر نرالے سے حسیں تھے اور روشن تھے
وہ دن کیا دن تھے بچپن کے
.... عجب دن تھے!

کبھی گرمی ستاتی تھی کبھی سردی لُبھاتی تھی
ہر اک موسم سہانا تھا وہ کیا اچھا زمانہ تھا
کبھی بارش کی چھَم چھَم تھی کبھی اولوں کی دُھم دُھم تھی
کہیں جھُولے تھے ساون کے کہیں آم اور جامن تھے
وہ دن کیا دن تھے بچپن کے
.... عجب دن تھے!

طبیعت ایسی نٹ کھٹ تھی سبھی سے اپنی کھٹ پٹ تھی
کبھی باجی سے اَڑ جانا کبھی بھیا سے لڑ جانا
ستانا سب کو جی بھر کے منانا ان کو پھر ڈھب سے
وہ کیا معصوم جذبے تھے کہ خوش ہوتے تھے اُن بَن سے
وہ دن کیا دن تھے بچپن کے
.... عجب دن تھے!

وہ دن جب یاد آتے ہیں تو رہ رہ کر ستاتے ہیں
بہت ان کو بلاتے ہیں مگر کب پاس آتے ہیں
جو لمحہ وقت کا گزرے کہیں جا کر وہ کھو جائے
وہ پھر مشکل سے ہاتھ آئے جو شے گر جائے دامن سے
وہ دن کیا دن تھے بچپن کے
.... عجب دن تھے!!

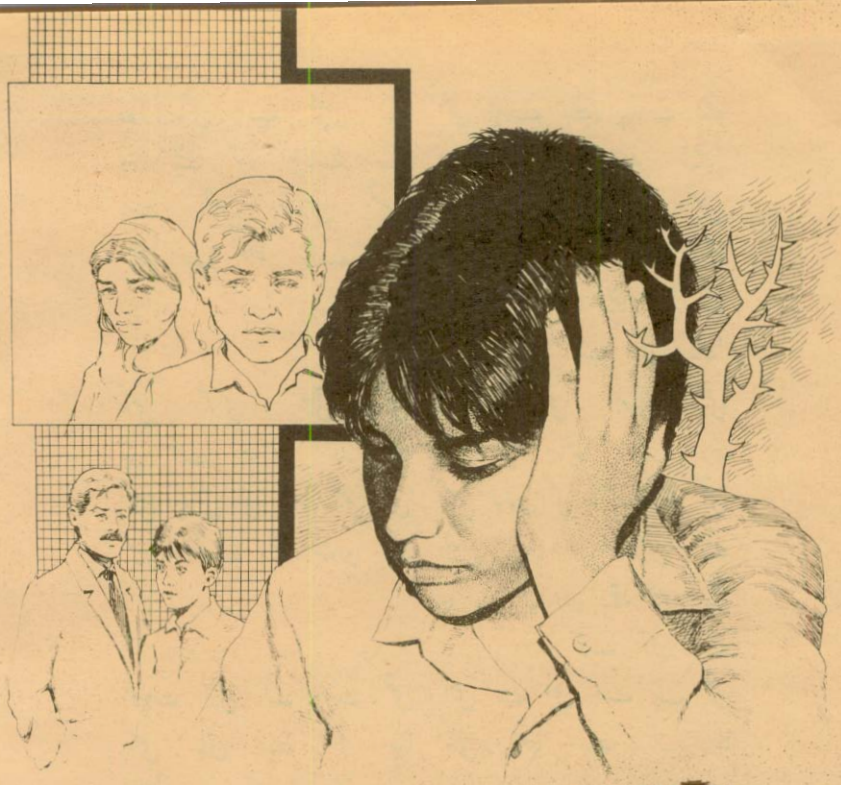

ہمیں کچھ ہو گیا تھا

نثار احمد زبیری

> حکومت کا فرض ہو گا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ بچہ اپنے بارے میں اپنی رائے کا پوری آزادی سے اظہار کر سکے اور اس کی رائے کو اہمیت بھی دی جائے۔

نام تو اس کا مُنیر الدین تھا، لیکن گھر والے پیار سے مُنّا کہتے تھے۔ ابتدا میں تو اسے اس نام پر اعتراض نہیں رہا لیکن پھر اسے یوں لگنے لگا جیسے مُنّا کہہ کر اس کی بے عزّتی کی جارہی ہو۔ وہ اب تیرہ برس کا تھا۔ ڈبل پروموشن لے کر نویں جماعت میں آگیا تھا اور نویں جماعت میں بھی اس کی ذہانت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن دو معاملے خراب تھے۔ ایک کا تعلق گھر سے تھا اور ایک کا اسکول سے۔ گھر میں وہ مُنّا تھا۔ جب کوئی اسے مُنّا کہہ کر پکارتا تو اسے یوں لگتا جیسے پتّھر کھینچ مارا ہو۔ مگر مشکل یہ تھی اماں ابّا بھی اسے مُنّا کہہ کر بلاتے تھے اور وہ ان کے احترام کی وجہ سے جواب دینے پر مجبور تھا۔ لیکن اسے یوں لگتا تھا جیسے برداشت کا کوئی پیالہ ہے جو آہستہ آہستہ لبریز ہوتا

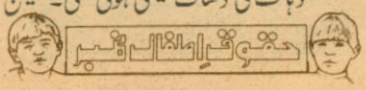

جارہا ہے۔ یہ پیالہ لبریز ہو جائے گا؟ اور اس کے لبریز ہونے پر کیا ہو گا، اسے معلوم نہ تھا۔ شاید وہ ٹھیک سے جانتا بھی نہ تھا کہ یہ پیالہ کسی دن لبریز ہو سکتا ہے۔

اسکول میں اس کا سلسلہ یہ تھا کہ ڈبل پروموشن نے اسے ساتویں سے نویں جماعت میں پہنچا تو دیا تھا لیکن اس کے ہم عمر ساتھی اس سے چھوٹ گئے۔ نویں میں اس کے نئے ہم جماعت اس کے مقابلے میں قد آور اور توانا تھے۔ ان کے درمیان وہ یوں لگتا تھا جیسے اونچے قد آور درختوں کے درمیان کوئی چھوٹا سا حقیر سا پودا۔ وہ حساب اور کیمسٹری میں بہت تیز تھا۔ جب استاد کلاس میں کوئی سوال کرتے اور پوری کلاس چپ کی چُپ رہ جاتی تو وہ بڑے اعتماد سے جواب دیتا اور ثابت ہو جاتا کہ ڈبل پروموشن تو کیا اگر ٹرپل پروموشن ممکن ہوتا تو وہ سیدھا دسویں میں جا سکتا تھا۔ اس کے درست جواب دینے پر جب استاد اس کی تعریف کرتے اور دوسرے لڑکوں کو شرم دلاتے تو وہ سمجھ لیتا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ ہم جماعت لڑکے پہلے ہی اسے کتابی کیڑا کہہ کر مذاق اُڑاتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتا اس کے پیچھے "کیڑے میاں — کیڑے میاں" کی آوازیں لگتی تھیں۔ طرح طرح کے فقرے گونجتے تھے۔ "ارے ہٹ جاؤ سامنے سے — کیڑے میاں آرہے ہیں"۔ جب لڑکوں کو گھر کا نام معلوم ہوا تو قیامت ہی آ گئی۔ وہ کیڑے میاں سے مُنّا کیڑا ہو گیا۔ یہ نام وہ دن میں اتنی بار سنتا تھا کہ اسے شبہ سا ہونے لگا کہ کہیں یہی اس کا اصلی نام تو نہیں — شاید اسکول میں بھی اس کے صبر کا پیالہ چھلک اٹھنے کے قریب تھا۔

اس کی دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی تھی۔ وہ بھائی جان کے جوتے میں اپنا پیر ڈال کر کھڑا ہو جاتا اور دیکھتا کہ اب کتنا فرق رہ گیا ہے — اور پھر گہری سوچ میں گم ہو جاتا۔ باجی ٹوکتیں۔ "ارے مُنّے کہاں کھوئے ہوئے ہو؟" وہ ہڑبڑا کر جاگ سا اٹھتا اور بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ بھائی جان کا جوتا واپس اس کی جگہ پر رکھ دیتا۔ وہ کھویا کھویا سا پریشان سا رہنے لگا تھا۔ تعلیم کی طرف اس کی قدرتی دلچسپی اور برتری برقرار تھی لیکن دوسرے ہر ایک معاملہ میں گڑ بڑ سی ہونے لگی تھی۔ وہ خود بھی حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے طرح طرح کے خواب بکثرت نظر آنے لگے۔ ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا کیڑا ہے — اتنا بڑا کہ اس کی دم فٹ بال گراؤنڈ کے ایک سرے پر ہے اور منہ دوسرے سرے پر۔ کیڑے نے چشمہ لگا رکھا ہے اور کتابوں پر کتابیں چٹ کرتا جا رہا ہے۔ پھر کیڑا لڑکوں کی چیئر پر جھپٹ پڑا اور دو تین لڑکوں کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس رات وہ ٹھیک سے سو نہ سکا۔ صبح اٹھا تو بخار سا تھا۔ ذرا سی دیر میں بخار سے جسم تپنے لگا۔ اسے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

گھر اور ہسپتال میں بیماری سے لڑ کر جب وہ صحت یاب ہوا تو اسے کچھ ہو گیا۔ نہ جانے کیا۔

جائیں تو جائیں کہاں

وہوا (نامہ نگار) ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفسر ڈیرہ غازی خان نے ہائی اسکول ڈونہ کا سالانہ معائنہ کیا۔ دورانِ ٹیسٹ کلاس ہشتم کو ریاضی کا ایک سوال حل کرنے کو کہا گیا تو ایک طالب علم بھی سوال حل نہ کر سکا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ڈی ای او نے ریاضی کے استاد کو کہا کہ وہ یہ سوال بلیک بورڈ پر حل کر کے طلبا کو دکھائے۔ یہ سُن کر استاد پریشان ہو گیا اور کہا کہ یہ سوال میری سمجھ سے باہر ہے۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفسر نے مذکورہ ٹیچر سے کہا کہ وہ پورے نصاب سے کوئی ایک سوال بلیک بورڈ پر طلبا کو سمجھادے تو ٹیچر نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ پڑھانے سے بالکل قاصر ہے۔ بعد ازاں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر طلبا کو "استاد" کے رحم و کرم پر چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

روزنامہ پاکستان لاہور

اس کی بھوک اڑ گئی۔ وہ ہر وقت بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ سوتے سوتے سہم کر اٹھ بیٹھتا۔ اس وقت اس کا جسم پسینے میں شرابور اور بُری طرح کانپ رہا ہوتا۔ اس کی وجہ سے گھر کا گھر پریشان ہو گیا۔ اب وہ کسی قیمت پر اسکول جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔

جس دن ابو اسے پہلی بار ماہرِ نفسیات کے پاس لے گئے اس دن وہ کچھ زیادہ ہی اُلجھا ہوا تھا۔ وہ گاڑی میں آگے بیٹھنے کے لئے بضد تھا۔ امی چاہتی تھیں ان کے پاس بیٹھے۔ وہ بڑے لوگوں کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "بس آگے بیٹھ کر جاؤں گا..... ورنہ نہیں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ واپس گھر کے اندر جانے لگا۔ اس دن بھائی جان کو کچھ احساس ہو گا کہ معاملہ کافی سنجیدہ ہے ورنہ منیر ابو سے مباحثہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے پہلے کچھ دیر ابّو سے تنہائی میں بات کی پھر مُنّے کو اندر بلایا گیا جہاں وہ مریض کی کرسی پر جا کر بیٹھنے کی بجائے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ ابّو اسے ڈاکٹر کی طرف متوجہ کرنے ہی والے تھے کہ ڈاکٹر نے انہیں اشارے سے منع کر دیا اور جا کر خود بھی مُنّے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی پچھلے برآمدے میں کُھلتی تھی جہاں خاموشی اور سناٹا تھا اور ایک بلّی ادھ کُھلی آنکھوں کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی بلّی کے تین چار بچے بڑی دلچسپ سی جنگ میں مصروف تھے۔ مُنّا بڑی محویت سے بچّوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سب ایک ہی سائز کے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جسموں پر سنہرے اور بھورے رنگوں کے دھبے بڑے ہی خوبصورت لگ رہے تھے۔ مُنّے کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ ڈاکٹر کب آکر اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس وقت چونکا جب ڈاکٹر نے ایک بچّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان میں سب سے شریر وہ والا ہے جس کے دو کان بالکل سفید ہیں!"

مُنّے نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا جو اس کے برابر کھڑا بلّی کے بچوں کی دلچسپ جنگ کو دیکھ رہا تھا۔ اور منے کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ تھا۔ وہ پھر بولا۔

"وہ ہے نا...... ناک پر دو دھبّوں والا...... وہ شاید سب سے سیدھا ہے۔۔۔ کتنے مزے کا لگ رہا ہے...... ہے نا......؟"

"ہاں!" مُنّا بھی بغیر کسی طرف دیکھے بول پڑا۔

"یار سنو!" اب ڈاکٹر نے مُنّے کے کندھے پر ایک پیار بھرا ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔" ان بدمعاشوں کی ایک فلم نہ بنائیں؟ وی سی آر پر دیکھیں گے۔" مُنّا چپ چاپ ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا جو بڑی محبّت سے اب منے کو دیکھ رہا تھا۔ اور اسے ریڈیو کیمرے کے کھیل میں شریک ہونے کی کھلی دعوت دے رہا تھا۔ ڈاکٹر آہستہ سے ...... اتنی آہستہ سے بولا کہ بلّی کے بچّے بھاگ نہ نکلیں۔ "تم یہیں ٹھہرو ...... میں کیمرا لاتا ہوں......"

ایک دو منٹ بعد ویڈیو کیمرا مُنّے کے ہاتھوں میں تھا اور ڈاکٹر کے ہاتھ مُنّے کے ہاتھوں کو کنٹرول کر رہے تھے۔ کیمرے کی گھرر گھرر کے سوا کمرے میں کوئی آواز نہ تھی۔ ڈاکٹر نے مشکل سے چار پانچ منٹ میں مُنّے سے دوستی کر لی تھی۔ ابّو حیران تھے کہ ڈاکٹر نہ مُنّے سے کچھ پوچھ رہا ہے نہ کوئی ٹیسٹ لکھ رہا ہے نہ دوا کھانے کی ترکیب بتا رہا ہے۔ اس

مجھے کیا غم

ایک دفعہ بلخ میں شدید قحط پڑا۔ لوگ سخت پریشان ہوگئے۔ حضرت شفیق بلخیؒ نے ایک غلام کو بازار میں بہت خوش خوش دیکھا تو پوچھا: "اے غلام! خوشی اور مُسرّت کا کون سا موقع ہے؟ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ لوگوں کی بھوک کی وجہ سے کیا حالت ہو رہی ہے؟"

"مجھے کیا ڈر یا غم۔ میں تو کسی کا غلام ہوں۔ اس کے بہت سے گاؤں ہیں اس کے پاس اناج بھی خوب ہے۔ وہ ہرگز مجھے بھوکا نہ رکھے گا۔"

یہ سُن کر آپ کی حالت غیر ہوگئی۔ آپ نے فرمایا:

"یاالٰہی، یہ غلام اپنے اس مالک کی وجہ سے جس کے پاس اناج کے چند ڈھیر ہیں اس قدر خوش ہے۔ تو، تو مالک الملک ہے۔ تو ہمیشہ روزی دینے والا ہے۔ بھلا میں کیوں غم کھاؤں!"

مرسلہ ...... عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ

ے برعکس وہ مُنّے سے دنیا جہان کی باتوں میں لگ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں پُرانے دوست ہوں۔ پندرہ بیس منٹ بعد ڈاکٹر بولا۔

"اچھا مُنیر! پرسوں آکر وی سی آر پر یہ فلم دیکھو گے نا؟"

"ہاں۔" منیر نے دلچسپی کے ساتھ کہا۔ ابّو نے نوٹ نہیں کیا کہ ڈاکٹر نے اسے ایک بار بھی مُنّا کہہ کر نہیں بلایا...... بلکہ ہر بار اسے مُنیر کہا اور اس کے نام کی تعریف بھی کی۔

کلینک سے واپسی پر گاڑی کے اندر ماحول صاف

بہتر تھا۔ مُنیر کے چہرے پر نہ کھنچاؤ تھا نہ غصے کی جھلک۔ وہ آرام سے پچھلی سیٹ پر امّی کے پاس بیٹھ گیا اور ان سے پوچھا۔ "کیا ہم ایک ویڈیو کیمرہ لے سکتے ہیں.....؟" امّی نے اسے یہ کہہ کر خوش کر دیا کہ ....."ہاں! تم چاہو تو آج ہی....."

ڈاکٹر نے ابّو کو کل اور مُنیر کو پرسوں بلایا تھا۔ ابّو جب کلینک پہنچے تو ڈاکٹر نے چند جملوں میں ان کے بچّے کی سب کیفیت بیان کر دی ...... " آپ کا بچّہ تنہا ہو گیا ہے شکیل صاحب! وہ بچّہ ذہین ہے، بلکہ بڑی حد تک جینئس ہے۔ ڈبل پروموشن تو اسے بہت اچھا لگا کہ لیکن اس سے اس کے دوست چھن گئے۔ نئی کلاس کے لڑکے عمر میں اس سے بڑے ہیں اور اس کی ذہانت سے حسد کرتے ہیں ___ اب آپ یا تو ڈبل پروموشن ختم کرا کے اسے ایک کلاس پیچھے لے آیئے ___ یا پھر اس کے نئے دوستوں کا انتظام کیجئے ___ اگر یہ ناممکن ہو تو پھر آپ خود ہی اس کے دوست بن جایئے۔"

"میں اس کا دوست بن جاؤں!" ابّو نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں، کیوں نہیں! بس ہر روز ذرا سی دیر اس کے ساتھ کھیلئے اس کی باتوں میں دلچسپی لیجئے۔ شکیل صاحب! "ڈاکٹر زور دے کر بولا" ذہین بچّے کا باپ ہونا معمولی بات نہیں۔"

ابّو سوچ میں پڑ گئے تو ڈاکٹر پھر بولا ___ "مُنیر کی شخصیت بننے کا مرحلہ جاری ہے۔ وہ بہت ذہین ہونے کی وجہ سے بہت حساس ہے۔ دوسرے بچّوں کی طرح اس کے سیکھنے کا عمل جاری تو ہے لیکن مُنیر کے لئے اس عمل کی رفتار تیز ہے۔ دوسرا بچّہ جو بات دس پندرہ منٹ میں سمجھ پاتا ہے، منیر اسے دو چار منٹ میں سمجھ لیتا ہے۔ پھر وہ چاہتا ہے اسے اب بڑا سمجھا جائے ...... لیکن آپ لوگ اسے بدستور مُنّا کہہ رہے ہیں۔ عام ذہانت والا بچّہ ہوتا تو شاید سب کچھ ٹھیک رہتا۔ لیکن مُنیر عام بچّہ نہیں ہے۔ آپ جس قدر جلد یہ احساس کر لیں اتنی ہی جلد وہ صحت مند اور نارمل ہو جائے گا۔"

ابّو کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب ڈاکٹر نے مُنیر کو دیکھ کر نام پوچھا، نہ خیریت بلکہ فوراً اس تجربے میں شریک ہو گیا جو مُنیر بلّی کے بچّوں کو دیکھتے ہوئے محویت کے عالم میں حاصل کر رہا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر نے پہلے ہی لمحے سے مُنیر کو اپنا دوست بنا لیا۔

گھر کی فضا میں تبدیلی کے بعد ...... مُنیر کی شخصیت بننے کا عمل تیز ہو گیا...... وہ موٹا تازہ تو کبھی نہیں تھا لیکن بیمار بھی نہیں رہتا تھا۔ اسے گھر میں کئی دوست مل گئے۔ اسکول سے اس کی ماہانہ رپورٹ بہت اچھی آئی تو سب کے چہرے کھل گئے ___ ابو کو فخریہ رپورٹ دکھاتے ہوئے اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "مجھے کیا ہو گیا تھا ابّو......؟"

ابّو نے ہنستے ہوئے کہا ...... "بیٹے تمہیں نہیں، ہم لوگوں کو کچھ ہو گیا تھا جو اب آئندہ نہیں ہو گا......!"

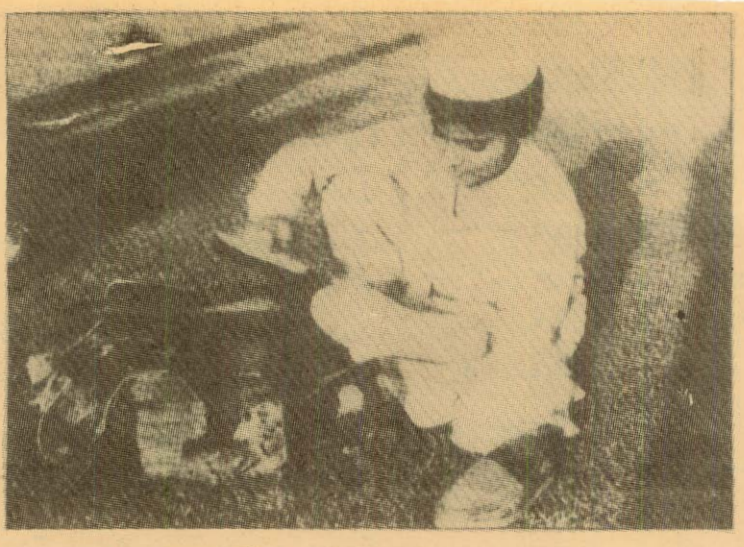

محنت کش بچے

اشفاق احمد ناز

ایشیا کے ممالک کے بچے تقریباً ایک ہی قسم کی مسائل کا شکار ہیں۔ دس سال کا بچہ بھارت میں آتشبازی بناتا ہے۔ پاکستان میں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتا ہے۔ نیپال میں قالین بُنتا ہے اور سری لنکا میں باغوں میں کام کرتا ہے۔ وہ سب افلاس کے مارے، غیر متوازن غذا اور خرابیٔ صحت کے یکساں مریض ہیں۔ وہ پڑھنے لکھنے کی عمر میں کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح آبادی کا بیشتر حصہ تعلیم سے بالکل محروم رہ جاتا ہے۔ نیپال کے علاوہ باقی تین ممالک برطانوی سامراج کے تحت عرصہ تک رہے ہیں۔ اس لئے وہاں ابھی تک انگریزوں کے فرسودہ قانون ہی کام کرنے والے بچوں کو تھوڑا بہت تحفظ دیتے ہیں۔ کھانے، پینے اور دوا علاج کے متعلق ان کو اپنے حقوق کا علم ہی نہیں ہے۔ ان سے متعلق جو اعداد شمار جمع کئے گئے ہیں وہ بیشتر دُرست نہیں ہیں۔ بھارت میں سب سے زیادہ کام کرنے والے بچے ہیں۔ ان کی تعداد اٹھارہ لاکھ بتائی جاتی ہے لیکن دراصل وہ تعداد میں ۲۴ لاکھ سے ایک کروڑ کے درمیان ہیں۔ پاکستان میں کام کرنے والے بچوں کی تعداد نسبتاً کم ہے یعنی آبادی کا تین فیصد سے کچھ زیادہ ہے۔ بنگلہ دیش اور سری لنکا میں کام کرنے والے بچوں کی تعداد کا کبھی تخمینہ نہیں لگایا گیا جبکہ نیپال میں سرے سے کسی نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں کام کرنے والے بچوں کی

موجودگی ضروری ہے اور ان کے خیال میں یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور بچوں کو کام پر لگانے سے ان کا استحصال نہیں ہوتا۔ بچے اپنے سرپرستوں کی زیرنگرانی سب زیادتیاں سہتے رہتے ہیں۔ کام کرنے والے بچوں سے دلچسپی رکھنے والے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں سے کام لینے کی وجہ صرف غربت ہی نہیں بلکہ ان سے نفع کمانا ہے۔ ان کے حقوق کے متعلق بہتر قوانین نہیں ہیں نہ ہی بچوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جس سے وہ بہتر کام حاصل کر سکیں۔ نیپال غربت میں دنیا میں دوسرے نمبر کا ملک ہے۔ وہاں دیہات میں رہنے والے بچے شہروں میں کام حاصل کرنے یا سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کیلئے منتقل ہو رہے ہیں۔ دیہاتوں میں ان کی معاشی حالت بہت بدتر ہے۔ سڑکوں پر پھرنے والے بچے یا تو کوڑا جمع کرنے یا جوتے پالش کرنے جیسے حقیر پیشے اختیار کرتے ہیں یا وہ غنڈوں کے ہتھے چڑھ کر جرائم پیشہ بن جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں بچوں کی ایک بڑی تعداد جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں گھروں میں معمولی ملازمت کرتے ہیں۔ بچہ خود کو زندہ رکھنے کے لئے بڑوں جتنا کام کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ بغیر تنخواہ صرف معمولی کھانے پر ہی کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہی۔ آئین کے تحت بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان میں بچوں کو ایسے کاموں میں ملازم رکھنے پر پابندی ہے، جہاں خدشہ ہو کہ ان کی صحت پر اس کا بُرا اثر ہو گا لیکن اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ان کو ایسی فیکٹریوں میں کام پر لگایا جاتا ہے جہاں سخت گرمی اور بدبودار دھواں بچوں کی صحت پر بُرا اثر ڈالتا ہے، پاکستان میں کام کرنے والے بچوں پر سب سے زیادہ سختیاں اینٹوں کے بھٹوں پر ہوتی ہے جہاں ان سے جبریہ کام لیا جاتا ہے۔ خرکار ان سے جانوروں جیسا کام لیتے ہیں۔ کام کرنے والے بچوں کی عمر ۱۴ سے ۱۲ سال کر دی جائے بشرطیکہ وہ صحت مند ہوں اس کے بعد ان کی اجرت اور دوسری مراعات بالکل دوسرے بڑے محنت کش کے برابر ہو۔ ان کو اپنی یونین بنانے کا بھی حق ہو۔ چوٹ لگنے یا موت واقع ہونے کی صورت میں انہیں بڑوں جتنا معاوضہ دیا جائے۔ اس طرح ان کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے اور ٹریڈ یونین ان کے حقوق کی نگرانی کر سکیں گی۔ تمام ممالک کو چاہئے کہ وہ ہر کام کرنے والے بچوں سے متعلق اپنے لیبر قوانین میں مناسب ترمیم اور اضافہ کریں۔ انہیں یہ لیبر قوانین برطانیہ کے سامراجی دور سے ورثہ میں ملے ہیں۔ وقت اور زمانہ کے ساتھ وہ فرسودہ اور غیر ہوٹر ہو کر رہ گئے ہیں۔ تمام ایشیائی ممالک کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا بغور جائزہ لے کر ایسے قوانین وضع کئے جائیں جو موجودہ دور میں ان ممالک کے لئے قابلِ عمل ہوں اس طرح وہ قوانین کام کرنے والے بچوں کا استحصال ہونے سے روک سکیں گے۔

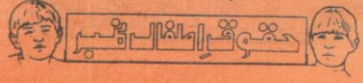

بچّوں کے مقبول مصنف اشتیاق احمد کے قلم سے

بچاؤ

تیسری قسط

فاروق، محمود اور فرزانہ تینوں گھر میں اکیلے تھے۔ انسپکٹر جمشید اور ان کی بیگم کسی عزیز کی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے اور رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ لوگ لحافوں کی راحت بخش گرمی میں دبکے نیند کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک انسپکٹر جمشید کے گھر کا دروازہ دھڑدھڑایا جانے لگا۔ تینوں بہن بھائی اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا کیونکہ دستک کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت گھبراہٹ میں ہے۔ ایک زخمی شخص دروازے سے اندر داخل ہوا اور فوراً دروازہ بند کر دیا اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔ تینوں کی کوشش سے جب وہ ہوش میں آیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پاس موجود بیگ میں ملک کا کوئی اہم راز ہے اور دشمن بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس کی تلاش میں ہیں۔ بیگ کو محفوظ کر دیا گیا۔ اسی وقت دوبارہ دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز آئی۔ اور جب تھوڑی دیر تک کسی نے دروازہ نہ کھولا تو باہر موجود افراد نے اسے توڑ ڈالا۔ ایک پٹ ذرا سا کھلا اور اس میں سے کلاشن کوف کی نالی جھانکنے لگی۔

وہ دس مسلّح افراد تھے۔ انہوں نے آتے ہی محمود، فاروق اور فرزانہ کے ہاتھ پیر رسّیوں میں باندھے اور ایک کمرے سے زخمی شخص کو بھی تلاش کر لائے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ زخمی شخص ملک کے مایہ ناز سائنس دان پروفیسر عمران جاہ ہیں جو انشارجہ میں ایک ریسرچ سینٹر سے کوئی خطرناک فارمولا اُڑا کر اپنے ملک لائے ہیں مگر عین وقت پر اس چوری کا علم ہو جانے کے باعث کچھ لوگ انشارجہ سے ہی ان کے تعاقب میں تھے اور بالآخر انہیں پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ محمود وغیرہ دشمنوں کو باتوں میں لگا کر وقت ضائع کر رہے تھے اور انتظار میں تھے کہ باہر سے کوئی مدد آجائے۔ مگر دشمن بھی چالاک تھے۔ ان کی چال سمجھ گئے اور تشدد پر اتر آئے۔ بانکے نامی ایک بدمعاش نے جب خنجر سے فاروق کے کان کی لو کاٹنے کی کوشش کی تو فرزانہ نے چیخ کر اُس بیگ کا پتا بتانے کا وعدہ کر لیا جس میں اہم راز پوشیدہ تھا۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

"خبر دار فرزانہ! ہر گز نہ بتانا...... یہ کوئی ہمارا ذاتی معاملہ نہیں ہے، یہ معاملہ ہے ملک اور قوم کا، بیگ میں ملک کی امانت موجود ہے...... جو جان پر کھیل کر یہاں تک لائی گئی ہے۔" محمود نے جذباتی آواز میں چلّا کر کہا۔

"ارے تو کیا میں فاروق کے کان کی لو کٹ جانے دوں!!!"

"کان کی لو تو کیا...... ملک کے لئے تو ہم سب کی جانیں حاضر ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"اچھی بات ہے...... کاٹ دو بھئی پھر تو۔" فرزانہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"کان کی لو کاٹنے کے لئے ہمیں تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔" بانکے نے جھلّا کر کہا۔

"بانکے...... باتیں نہ بناؤ... میں اس کی چیخ سننا چاہتا ہوں۔" اُستاد نے سرد آواز میں کہا۔

"بات اگر صرف اتنی ہے تو میں چیخ کر دکھا دیتا ہوں...... لو کاٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ لو...... شوق پورا کر لو۔" یہ کہہ کر فاروق زور سے چیخا۔

"مزا نہیں آیا...... اس لئے کہ نقلی اور اصلی میں فرق تو بہر حال ہوتا ہے...... اور اصلی چیخ کان کی لو کٹنے پر ہی سنائی دے سکتی ہے۔"

بانکے نے فاروق کے کان کی لو بائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور خنجر والا ہاتھ لو کی طرف لے آیا...... اسی وقت فرزانہ چلّا اٹھی:

"بیگ ہمارے اسٹور روم میں ہے۔"

"یہ...... یہ تم نے کیا کیا فرزانہ۔" محمود چلّا اٹھا۔

"میں تمہاری یہ غلطی کبھی معاف نہیں کروں گا۔" فاروق بولا۔

"مم...... میں نادم ہوں...... اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی۔"

"اب کیا حکم ہے اُستاد؟"

"اسٹور روم میں ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں...... یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔"

"اے خبردار! ..... ہم اور تو سب کچھ ہو سکتے ہیں ..... جھوٹے نہیں ہو سکتے ..... اپنے الفاظ واپس لو۔" فرزانہ غرّائی۔

"ہاں واقعی ..... واپس لو الفاظ ..... ہمیں نہیں ضرورت ایسے فضول الفاظ کی۔" فاروق مسکرایا۔

"یہ لوگ ہمیں چکر دے رہے ہیں ..... وقت گزارنا چاہتے ہیں۔" بانکا بولا۔

"تو پھر مجھے اجازت دو ..... میں ابھی بیگ اسٹور روم سے لا کر دکھا سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے ..... بانکے اس کے ہاتھ پیر کھول دو اور اگر یہ اسٹور سے بیگ نہ لا سکے تو اسے گولی مار دو۔"

"ہم اس کے باہر نکلنے کا انتظار کیوں کریں اُستاد ..... اسٹور روم میں ہی گولی کیوں نہ مار دی جائے۔"

"یہ اور اچھا ہے ..... یہاں خون نہیں پھیلے گا۔"

"اس قدر دہشت ناک باتیں نہ کریں ..... ہمیں ڈر لگ جائے گا۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"ڈرپوک چارہ تمہیں کیا لگے گا ..... اُلٹا تم ڈر کو لگ جاتے ہو۔" اُستاد نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ارے باپ رے ..... یہ تو ہم سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔"

"اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ..... خیر میں جا رہی ہوں بیگ لانے۔"

بانکا اس وقت تک اس کی رسیاں کاٹ چکا تھا ..... فرزانہ تیر کی طرح اسٹور روم کی طرف دوڑی ..... یہ دیکھ کر اُستاد چلّایا۔

"بانکا ..... دوڑ اس کے پیچھے ..... کہیں یہ کوئی چال نہ چل جائے۔"

"فکر نہ کرو اُستاد ..... یہ کل کی لڑکی اور ہم سے چال چل جائے۔" بانکا بولا اور اس نے بھی فرزانہ کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

"یہ الفاظ بھی واپس لینا پڑیں گے۔" فاروق نے گویا اعلان کیا۔

"بھئی ساتھ ساتھ لکھتے رہو ..... کہیں حساب لیتے وقت کچھ الفاظ بھول نہ جاؤ۔" محمود ہنسا۔

"ذہن میں لکھ رہا ہوں ..... ہاتھ تو اس وقت بندھے ہوئے ہیں۔"

عین اس وقت فرزانہ بیگ اٹھائے آتی نظر آئی ..... بانکا اس کے پیچھے تھا۔

"اس نے کوئی چال نہیں چلی اُستاد ....."

"حیرت ہے ..... اور یہ بیگ وہیں تھا۔"

"ہاں! وہیں تھا، چیزوں کے درمیان اس طرح چھپایا گیا تھا کہ ہمیں بالکل نظر نہ آ سکا۔"

"اندھے ہو تم ..... بلا وجہ اتنا وقت ضائع ہوا۔"

"افسوس! میں تو بالکل غلط جگہ بیگ کو لے

آیا..... میں نے تو ان کے بارے میں نہ جانے کیسی کیسی باتیں سُنی تھیں..... یہ ایسے ہیں اتنے بہادر ہیں..... اتنے دلیر ہیں..... اتنے ذہین ہیں..... اتنے چالاک ہیں، اتنے ہوشیار ہیں..... اتنے کائیاں ہیں..... یہ تو کچھ بھی نہیں نکلے..... خاک بھی ثابت نہیں ہوئے۔" پروفیسر عمران جاہ نے تلملاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"کھولو اس بیگ کو اور دیکھو..... وہ چیز اس میں ہے یا نہیں۔"

"بانکے نے بیگ فرش پر رکھا اور لگا اس کی زِپ کھولنے، زِپ ٹس سے مس نہ ہوئی.....

"کیا بات ہے؟..... تم سے زِپ نہیں کھل رہی۔"

"شاید خراب ہو گئی ہے۔"

"ارے تو چاقو سے بیگ کو کاٹ ڈالو۔" اُستاد نے جھنّا کر کہا۔

اس نے خنجر نکالا اور بیگ کو چاک کر دیا.....

"ارے یہ کیا؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا بات ہے!؟" استاد چونکا۔

"اس میں تو ٹوٹے پھوٹے کھلونے بھرے پڑے ہیں۔"

"ہاں! ہمارے اسٹور روم میں اس وقت صحیح سلامت کھلونے موجود نہیں تھے..... اور رہی بات زِپ کی..... اس پر میں نے ایلفی اُلٹ دی تھی۔ میں نے سوچا..... اس طرح بھی آپ لوگوں کا ایک منٹ تو ضائع ہو گا ہی۔"

"وہ مارا..... میں اپنے تمام الفاظ واپس لیتا ہوں۔" پروفیسر عمران جاہ چلّائے۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے پروفیسر صاحب..... دے دیں گے بعد میں۔"

"دیکھا..... تم نے..... یہ ہمیں بھی..... ارے..... وہ لڑکی کہاں گئی۔" اُستاد چلّایا۔

"مکھی بن کر اُڑ گئی..... یہ اس کی بہت پُرانی عادت ہے۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تلاش کرو..... بیگ میں موجود چیز بھی اس نے کہیں چھپائی ہوگی۔"

"اس نے نہیں..... ہم نے ہا ہا ہا۔" محمود ہنسا۔

"تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" اُستاد نے اسے گھورا۔

"تب پھر اور کس میں ہنسنے کی بات ہوتی ہے؟"

"خاموش!!!" وہ دھاڑا۔

"جج..... جی بہتر۔"

اس کے تمام ساتھی اِدھر اُدھر دوڑ گئے..... مکان قدموں کی آوازوں سے گونجنے لگا..... عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی..... اُستاد زور سے اچھلا۔

"یہ..... اس وقت کون آ گیا؟"

"دروازہ ہٹا کر دیکھ لیتے ہیں....." محمود مُسکرایا۔

"ہٹا کر!"

"ہاں! ٹوٹا ہوا دروازہ کھولا نہیں جاتا نا۔"
محمود بولا۔

"تم لوگ دوسروں کا دماغ چاٹ جانے کے ماہر ہو شاید......"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف چلا گیا...... پھر اس نے دبی آواز میں کہا۔

"باہر کون ہے۔"

"بیگم شیرازی...... انسپکٹر جمشید کی پڑوسی۔"

"اس وقت یہ لوگ فارغ نہیں ہیں...... ٹھہر کر آیئے گا۔"

"آنٹی...... فوراً پولیس کو فون کریں...... ہم اس وقت دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔" محمود نے بلند آواز میں کہا

"میرا بھی یہی خیال تھا...... تم فکر نہ کرو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اُستاد نے ایک جھٹکے سے دروازے کی رکاوٹ کاٹ دی اور پٹ ایک طرف کر کے باہر نکلا...... وہ چاہتا تھا، اس عورت کو پکڑ کر اندر کھینچ لے...... لیکن فوراً ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی......

رائفل کے بٹ نے اسے لمبا لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"باہر ہم ہیں محمود...... کیا ہم اندر آجائیں...... ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ تو نہیں ہوگی؟" سب انسپکٹر اکرام کی آواز سنائی دی۔

"اوہ...... جلدی آجائیں انکل...... اور کچھ آدمی باہر بھی رہنے دیں......"

سب انسپکٹر اکرام اور اس کے ماتحت فوراً اندر گھس آئے......

"باقی دشمن کہاں ہیں؟...... بیگم شیرازی نے تو فون پر بتایا تھا کہ یہاں اندر زبردست گڑ بڑ لگتی ہے۔"

"وہ فرزانہ کو تلاش کر رہے ہیں...... اب جو واپس آتا جائے...... آپ اسے قابو میں کرتے جائیں اور ہاں اب ہمیں کھول بھی دیں...... بہت دیر ہو گئی بندھے ہوئے۔"

"تو کیا انہوں نے فرزانہ کو نہیں باندھا تھا۔"

"باندھا ضرور تھا، لیکن وہ ہم سے زیادہ چالاک ہے...... اپنی رسیاں کھلوانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور پھر ایک دم سرک بھی گئی۔"

سب انسپکٹر اکرام ہنسنے لگے...... اس وقت بانکا آتا نظر آیا۔

"اُستاد وہ کہیں نہیں............"

"اس کے الفاظ درمیان میں رہ گئے...... اُستاد تو وہاں سے غائب تھا۔

"شاگرد سے بات کر لو بانکے۔" اکرام نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اوہ! تو آپ اسے جانتے ہیں۔"

"یہ نامی گرامی غنڈہ ہے۔"

"تب تو ان کا اُستاد ان سے زیادہ نامی گرامی ہوگا۔"

"ابھی اس کی شکل دیکھنے کا موقعہ نہیں مل سکا....."

"اسے باندھ تو دیا؟"

"ہاں باہر بندھا پڑا ہے۔"

اکرام کے ماتحتوں نے بانکے کو بھی باندھ دیا اور پھر جو بھی آتا گیا..... وہ اسے باندھتے چلے گئے..... یہاں تک کہ نو کے نو بندھے نظر آئے..... اب اُستاد کو بھی اندر گھسیٹ کر لایا گیا.....

"اوہ!..... یہ راجو چوڑی ہے۔"

"چوڑیاں بیچتا ہے؟" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ارے نہیں..... بس یہ اس کا مجرمانہ نام ہے..... یہ مجرم لوگ اپنے نام بھی عجیب و غریب رکھتے ہیں..... ہاں یہ چکر کیا ہے؟"

"چکر سے پہلے ہمیں فرزانہ کو اطلاع دینی چاہئے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"پتا نہیں..... اندازہ ہے کہ اپنے کمرے میں داخل ہو کر وہ کھڑکی کے ذریعے پائیں باغ میں چلی گئی ہوگی اور وہاں سے کسی درخت پر۔"

"تو بلاؤ اسے، اس قدر سردی میں درخت پر تو اس کی قلفی جم جائے گی۔" اکرام نے گھبرا کر کہا۔

فاروق اپنے کمرے میں آیا۔ پائیں باغ کی کھڑکی کھولی اور بلند آواز میں بولا۔

"فرزانہ..... خطرہ ٹل گیا ہے..... آجاؤ۔"

اس نے چند سیکنڈ انتظار کیا..... فرزانہ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا..... اب اس نے اور بلند آواز میں کہا۔

"فرزانہ تم کہاں ہو؟..... سب حالات ٹھیک ہو چکے ہیں..... انسپکٹر اکرام آچکے ہیں..... تمام دشمن بندھے پڑے ہیں..... بس تمہاری کمی محسوس ہو رہی ہے..... اب زیادہ پریشان نہ کرو..... آجاؤ۔"

فرزانہ کی طرف سے اب بھی کوئی جواب نہ ملا..... فاروق پریشان ہو گیا..... وہ پوری قوت سے چلایا۔

"فرزانہ..... کہاں ہو؟..... جواب کیوں نہیں دے رہیں۔"

اس کی چیخ سن کر محمود اور اکرام بھی وہاں آگئے۔

"کیا بات ہے..... کیوں چیخ رہے ہو؟"

"فرزانہ جواب نہیں دے رہی۔"

"کیا مطلب؟"..... ان کے منہ سے نکلا۔

اور پھر انہوں نے فرزانہ کو سارے پائیں باغ میں چھان مارا لیکن..... اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ عین اس وقت ملٹری کی ایک گاڑی آکر رکی..... اس سے دھڑا دھڑ مسلح آدمی نیچے کودنے لگے..... مکان کو فوراً گھیرے میں لے لیا گیا..... پھر ایک فوجی آفیسر اپنے تین ماتحتوں کے

ساتھ ان کی طرف بڑھا۔

"پروفیسر...... عمران جاہ بیگ لے کر یہاں آئے تھے؟"

"جج ...... جی ...... آپ ...... آپ کون ہیں۔"

"میں میجر سلیمان دارا ...... پروفیسر عمران جاہ ہمارے ساتھ ہیڈکوارٹر جائیں گے ...... ان کے ساتھ وہ چیز بھی ہونی چاہئے ...... جو یہ دشمن ملک سے اڑا کر لائے ہیں۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہو گیا جناب۔" اکرام نے کہا

"کیا بات ہے؟ ...... کیا ہو گیا؟" اس نے حیرت کے عالم میں کہا۔

محمود نے ساری کہانی سنا دی......

"ان لوگوں کو قابو کر لو ...... اور اپنے ساتھیوں کو کھول دو۔" میجر نے مسکرا کر کہا

"کیا!!!؟" وہ چلّایا۔

(پھر کیا ہوا؟ اگلے شمارے میں پڑھیے)

بچّوں کے مشہور و معروف مُصنّف

اشتیاق احمد

کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور ناول

۳۹۱۔ فریبی مجرم ——— انسپکٹر جمشید سیریز ——— ۱۰ روپے

۳۹۲۔ کیمرے کا قاتل ——— "

۳۹۳۔ ناکامی کا تحفہ ——— منی خاص نمبر ——— ۱۸ "

۱۵۔ ایک سازش ایک جال ——— " " ——— ۱۸ "

۱۶۔ زہریلا کمرہ ——— انسپکٹر جمشید سیریز ——— ۱۰ "

۸۔ پُراسرار مجرم ——— " ——— ۱۰ "

۸۔ راج محل ——— انسپکٹر کامران مرزا سیریز ——— ۱۰ "

۷۱۔ سُپر رینز ——— شوکی سیریز ——— ۱۰ "

۱۔ چالیس علی بابا ایک چور ——— سُپر مسٹری سیریز ——— ۱۰ "

۲۔ غریب بادشاہ ——— کہانیوں کا نیا سلسلہ ——— ۴/۵۰ "

۳۔ دو دفعہ کا ذکر ہے ——— " " " ——— ۴/۵۰ "

۴۔ کنجوس حاتم طائی ——— " " " ——— ۴/۵۰ "

——— " " " ——— ۴/۵۰ "

۲۰ اپریل ۱۹۹۳ء

کو آپ کے شہر میں ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب

یا

پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد، مُسلم پورہ، سانده کلاں لاهور، ——— فون ۳۲۱۵۳۷

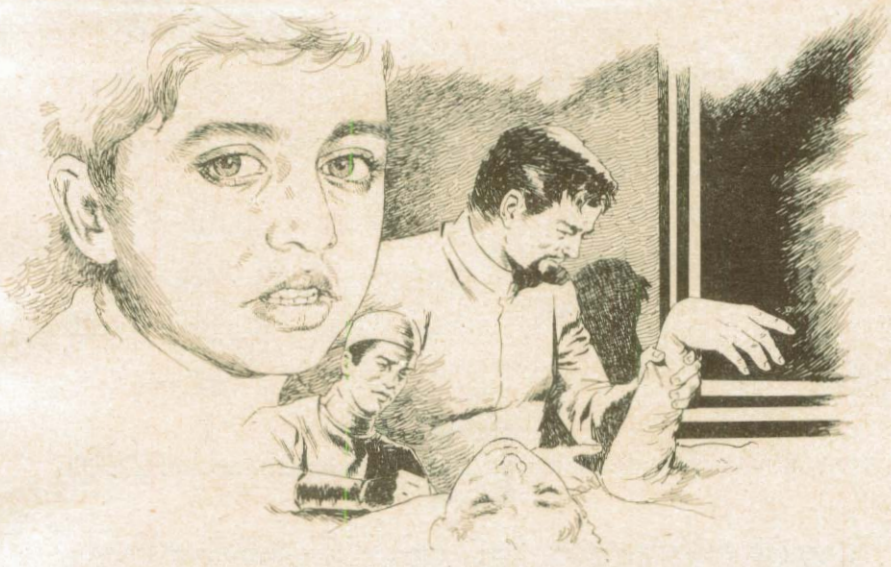

خُرّم مر رہا ہے

ڈاکٹر زعیم الحق

بچّوں کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے گا انہیں صحت کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ ننھے مُنّے بچّوں کے مرنے کی شرح کو کم کیا جائے گا۔

میں ٹیٹنس روم سے آرہا ہوں۔ وہاں ایک چھ سال کا بچّہ کل داخل ہوا تھا۔ خُرّم اس کا نام تھا۔ ٹیٹنس روم میں صرف ٹیٹنس یعنی تشنج کے مریض داخل کئے جاتے ہیں اور یہ بہت بُری بیماری ہوتی ہے۔ بالکل نوزائیدہ بچّے جو گھر میں پیدا ہوں اور جن کا "ناڑو" دائیاں کسی بھی گندی قینچی، چھُری یا بلیڈ وغیرہ سے کاٹ دیں۔ وہ زیادہ تر اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں مگر ان کی عمر میں اس بیماری سے بچ نکلنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

خُرّم چھ سال کا تھا اور کئی دنوں سے بیمار۔ جب ہمارے پاس لایا گیا تو اس کی حالت کافی خراب تھی۔

میں نے اسے داخل کیا مگر علاج شروع کرنے کے ساتھ ہی اس کے گھر والوں کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ بڑی موذی بیماری ہے اور آپ ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رہیں۔ میری یہ بات سنتے ہی اس کی ماں نیچے گر پڑی۔ میں گھبرا گیا کہ شاید یکدم یہ خبر سن کر بے ہوش ہو گئی ہے مگر جب نیچے جھکا تو اس

نے میرے پاؤں پکڑے ہوئے تھے اور رو رہی تھی۔ ماں کو روتے دیکھنا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ میں نے اسے اٹھایا وہ روتی جاتی اور کہتی جاتی کہ "ڈاکٹر جی! میرے بچے کو بچالو۔ ڈاکٹر جی! کہہ دو کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔" اور میں بے بسی سے بس یہی کہہ سکا کہ بی بی! دیکھو ہم پوری کوشش کریں گے۔ باقی میں دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تو خدا کا کام ہے۔

وہ خدا رسول کے واسطے دینے لگی کہ ایسا نہ کہو۔ کہہ دو کہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ میرا ایک ہی بچّہ ہے۔ خدا نے بیس سال بعد میری جھولی میں ڈالا ہے۔ ڈاکٹر جی میری جھولی کو بھرا رہنے دو۔ لیک فقیر کی جھولی میں بھی دو چار آنے تو ہوتے ہی ہیں۔ میری جھولی خالی نہ ہونے دو۔ میں نے بڑی منتیں مان کر، بڑے دھکے کھا کر، بڑی مصیبتیں جھیل کر اور بڑے طعنے سن کر یہ ایک لعل حاصل کیا ہے۔ خدا کے لئے میرا لعل ٹھیک کر دو۔ مجھے واپس کر دو۔

اس کے گھر والے نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور مجھ سے کہنے لگا "ڈاکٹر جی! آپ جائیں آپ کے کام کا حرج ہو رہا ہے یہ تو جھلّی ہو گئی ہے۔" میں وہاں سے چلا آیا۔ رات گئے میں اپنے کام سے فارغ ہو کر ڈاکٹرز روم میں بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا۔ خرّم کے باپ نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا اور پھر کہنے لگا۔ "ڈاکٹر جی اکیلے ہی ہو میں اندر آجاؤں۔" سیدھا سادا دیہاتی آدمی تھا مگر اس کے چہرے پر کسی بچّے کی سی معصومیت تھی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا مگر دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ اس ایک لمحے میں مجھے احساس ہوا کہ آنسو "ماں" کے دیکھنا بھی بڑا مشکل ہے مگر شاید مرد کی آنکھ میں آنسو دیکھنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ وہ بیٹھ گیا اور بولنے کی کوشش کرنے لگا مگر لفظ اس کے حلق میں پھنس جاتے اور وہ بار بار آنکھیں مسلنے لگتا۔ آنسو چھپانا بھی تو مشکل کام ہوتا ہے۔

آخر وہ اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا کہنے لگا ڈاکٹر جی! مجھے نہیں پتہ کہ آپ میرے بیٹے کے متعلق کیا بتانا چاہتے ہیں مگر مجھے پتہ ہے کہ کیا ہو گا؟ میرا خُرّم میرے گھر میں بیس سال بعد آیا تھا۔ ان بیس سالوں میں، میں نے اپنی ماں، اپنی بہنوں، اپنے بھائیوں کی طرح طرح کی باتیں اور قسم قسم کے مشورے سنے۔ مجھے دوسری شادی کا کہا گیا۔ کسی دوسرے کا بچّہ لینے کو کہا گیا مگر میں یہ باتیں بس سن لیتا۔ ڈاکٹر جی! بات سن سکنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ میرا ابّا گاؤں کے چوہدری کا مزارع تھا جب میں چھوٹا تھا تو ایک دفعہ ہمسائے کی چغلی کرنے پر میرے ابّا نے مجھے ڈانٹا تھا کہ ایسی بات نہیں کیا کرتے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تب میں چپ تو ہو گیا مگر یہ سوچتا رہا کہ اگر دیواروں کے کان ہو سکتے ہیں تو درختوں، مٹی، پتھر کے ڈھیروں، کھیت میں اُگی فصلوں اور دریا کے پانی کے بھی ہوتے ہوں گے۔ یہ بات میرے ذہن میں

ایسی بیٹھ گئی کہ میں اکثر جب پریشان ہوتا، جب میرے ابا کو چوہدری تنگ کرتا، فصل میں سے حصہ نہ دیتا، پیسے ڈک لیتا اور ہمارے گھر میں ہر طرف ہوک پھیل جاتی تو میں اکیلا کسی دریا کنارے یا کسی کھیت میں یا کسی درخت کے نیچے جا بیٹھتا اور اس سے باتیں کرنے لگتا۔ ڈاکٹر جی! آپ کہیں گے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے مگر قسم لے لو یہ سب میری باتیں سنتے تھے سمجھتے تھے، سر ہلاتے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ جواب میں کبھی اپنے دکھ نہیں کہتے تھے۔ بس سُن لیتے تھے تب میں نے یہ جانا تھا کہ اصلی یار تو یہ ہیں۔ ان کے پاس "میری" سننے کے لئے بڑا وقت ہے انہیں پتہ ہے کہ میری سننے والا کوئی نہیں تو انہوں نے کبھی مجھے "ناں" نہیں کی اور ڈاکٹر جی! یہ سب میرے ایسے صوفی یار تھے کہ انہوں نے کبھی "اپنی" کہنے کے لئے مجھے نہیں روکا۔ بس میری سن لیتے اور سر ہلا دیتے۔ تب میں نے ان سے سیکھا کہ بات کرنی تو سب کو آتی ہے مزا تو اس میں ہے کہ سن لو اور چپ ہو جاؤ۔ اس لئے ڈاکٹر جی! میں اپنے سب رشتہ داروں کی بات سن لیتا اور چپ ہو جاتا۔ اور پھر میری گھر والی کا اس میں کیا قصور تھا۔ یہ تو دینے والے کی دین ہے کیا پتہ میں دوسری شادی کر بھی لیتا تو بھی کوئی اولاد نہ ہوتی خرابی مجھ میں بھی تو ہو سکتی تھی۔

پھر میرے گھر میں خُرّم پیدا ہوا اور میں ابّا کے مرنے کے بعد پہلی دفعہ رویا۔ آپ سیانے آدمی ہیں آپ کو تو اندازہ ہو گا کہ اتنی دیر کے بعد ہونے

یہ ہماری دنیا کے بچے

- ......دنیا میں اس وقت محنت کش بچوں کی تعداد ۸۰ لاکھ ہے۔
- ...... پاکستان میں بچوں کی کل آبادی چھ کروڑ ہے جو کل آبادی کا ۵۵ فیصد ہے۔
- ...... پاکستان میں یتیم بچوں کی تعداد چار لاکھ سے زائد ہے۔
- ...... پاکستان میں کل ۱۴۱ یتیم خانے قائم ہیں جن میں یتیم بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی جاتی ہے معیاری یتیم خانوں کی تعداد دس سے زائد نہیں۔
- ...... پاکستان میں تین ایسے مثالی گاؤں قائم کئے گئے ہیں جس میں ۱۵ سے ۲۰ گھر ہوتے اور ہر گھر میں چھ سے سات یتیم بچوں کی پرورش کی جاتی ہے۔
- ...... پاکستان کے قوانین کے تحت ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں سے مزدوری نہیں لی جا سکتی لیکن اس کے باوجود لاکھوں بچوں سے مزدوری لی جاتی ہے
- ...... کم عمر مزدوروں کی ایک بڑی تعداد جسمانی صحت اور ذہنی توازن سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

والا بچّہ گھر بھر کا کتنا لاڈلا ہوتا ہے مگر سب لاڈ پیار کے باوجود میرا خرّم بڑا فرماں بردار، بڑا چپ سا تھا۔ میں اکثر اسے دیکھ کر سوچتا کہ یہ اس لئے تو چپ چپ نہیں رہتا کہ اگر ہمیں چھوڑ جائے تو زیادہ یاد نہ آئے۔کتنا برا خیال ہے ڈاکٹر جی مگر میرے ڈگ دماغ میں اکثر یہ بات آتی تھی۔ اور دیکھو وہی ہوا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ تسلّی دیں گے، کہیں گے کہ یہ بچ جائے گا ٹھیک ہو جائے گا مگر مجھے پتہ ہے کیا ہونے والا ہے؟ مجھے ہوا میں خاموشی سنائی دے رہی ہے' اندھیرے نظر آرہے ہیں جو بہت دور نہیں۔ اس کی آنکھیں اب بالکل بھیگ چکی تھیں۔کپڑے سے اس نے آنکھیں صاف کیں۔ مجھ سے وقت ضائع کرنے کی معافی مانگی۔ میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اس کی باتیں سن لیں اور اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی پھر چلا گیا۔ مجھے حیرانی سی ہوئی کہ یہ پہلا شخص تھا جو اپنے بچّے کے زندہ ہونے کے باوجود اس کے مرنے کی باتیں کر رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میں اپنے آپ کو کوئی مٹی پتّھر کا ڈھیر یا ٹوٹا پھوٹا اُجڑا سا درخت محسوس کرنے لگا کہ جس کے سامنے وہ بولتا رہا اور بھڑاس نکالتا رہا۔

خُرّم کی حالت واقعی کافی تشویش ناک تھی اس کے سانس کی نالی بیماری کے زیر اثر سُکڑ کر بالکل بند ہو رہی تھی ہم نے آپریشن کے ذریعے اس میں پلاسٹک کی ٹیوب بھی ڈالی مگر پھر بھی اب سے جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، کچھ دیر پہلے اس کی حالت بہت بگڑ گئی۔ بحیثیت ڈاکٹر آن ڈیوٹی مجھے بلا گیا۔ میں گیا، بڑے پر سکون انداز میں اسے دیکھا۔ دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ سانس رک گئی تھی، آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ میں نے اس کی موت کی تصدیق کی۔ ڈیتھ سرٹیفیکٹ بنایا۔

میں اس وقت فقط ایک پروفیشنل ڈاکٹر تھا۔ روایتی سا۔ ڈیتھ سرٹیفیکٹ میں نے اس کے لواحقین کے ہاتھ میں تھمایا۔ بڑے عام سے لہجے میں ان سے تعزیت کی کہ یہ ہمارا روز مرہ ہے اور یہ سب "فرائض" انجام دینے کے بعد کمرے میں آکر سونے کے لئے لیٹ گیا۔

میں لیٹ تو گیا مگر مجھے احساس ہوا کہ میں کانپ رہا ہوں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے میرا جسم بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے میرا سینہ یہاں سے وہاں تک پھیل گیا ہے اور اپنے ہی سینے میں میں دب رہا ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے، میرا اپنا ہی جسم چاروں طرف سے دبا کر مار دینا چاہتا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرے دانت میرے جبڑوں سمیت بڑے، اور بڑے، ہوتے جا رہے ہیں اور ایک دم کُھل کر انہوں نے مجھ دبوچ لیا ہے اور کچل رہے ہیں، میں چبایا جا رہا ہوں، میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔

ایک سال سے میرے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ایسا نہ تھا۔ حتیٰ کہ میڈیکل کالج پہنچ کر بھی میں نے کبھی ایسی حالت کا تصوّر نہیں کیا تھا۔ شروع میں تو خیر وارڈ وغیرہ کے متعلق زیادہ علم نہیں ہوتا مگر میں نے تو فائنل ائیر میں بھی۔

کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یوں کسی کی موت پر بلایا جاؤں گا۔ جا کر نبض دیکھوں گا۔ سانس چیک کروں گا۔ آنکھوں میں روشنی ڈالوں گا اور اس سارے عمل کے دوران بہت سارے لوگوں کے خیال میں زندگی اور موت کے درمیان واحد دیوار ہوں گا۔ پھر یہ دیوار گر جائے گی، لوگ رونا شروع کر دیں گے اور میں ڈیتھ سرٹیفیکٹ بنانا۔ جس پر لکھا ہوتا ہے۔ ڈیتھ کنفرمڈ بائی ڈاکٹر

....

میں تو ایک عام سا ہنستا کھیلتا انسان تھا۔ میرے دن بھی میرے ہوتے تھے اور راتیں بھی۔ مجھے ہنسنا بھی آتا تھا اور مسکرانا بھی۔ ہنسانا بھی اور گنگنا نا بھی۔ مجھے اُجلے کپڑے، چمکتے جوتے اور متوجہ کر لینے والی خوشبو کی عادت تھی۔ میرے ہونٹوں پر لفظ بھی ہوتے تھے، باتیں بھی اور قہقہے بھی۔ میرے انداز میں زندگی بھی تھی اور اس کی ساری رونقیں بھی۔ میری آنکھوں میں چمک بھی تھی روشنی بھی اور کبھی کبھی آنسو بھی۔ یہ کیا ہوا کہ میں نے سفید عبا پہن کر ایک مسیحا کا روپ اختیار کیا تو سب مسکراہٹیں، قہقہے، خوشبوئیں، روشنیاں گم ہو گئیں، حتیٰ کے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ یہ کتنی بڑی قیمت ہے کہ انسان اپنے آنسوؤں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ غم تو ہمیشہ ہمیشہ انسان کا ساتھی اور ساجھی ہوتا ہے پھر یہ سب کہاں چلے گئے۔

میں مسکرانا چاہوں، ہنسنا چاہوں تو نہیں مسکرا سکتا، نہیں ہنس سکتا کہ مریضوں کے درمیان قہقہے

جرم اور انصاف

○...... جب کوئی انسان شیر کو مارنے کی نیت سے جاتا ہے تو اسے شکار کھیلنا کہتے ہیں. لیکن جب شیر کسی انسان کو کھاتا ہے تو اسے درندگی کہتے ہیں. جرم اور انصاف میں صرف یہی فرق ہے۔ (برنارڈ شاہ)

مرسلہ...... جاوید اقبال عاجز

لگانا زیب نہیں دیتا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مریضوں سے نکل کر بھی مجھے ہنسنا نہیں آتا۔ اور کسی کے مر جانے پر افسردہ ہونا چاہوں تو یہ بھی مشکل ہے کہ اگر ایک کا غم محسوس کرنے بیٹھ گیا تو ان سب کا کیا بنے گا جو شاید میری توجہ اور کوشش سے بچ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کا تو کام یہ کوشش کرنا ہوتا ہے اور کوشش نیم دلی یا مُردہ دلی سے تو نہیں ہو سکتی۔

نتیجہ یہ کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ جیسے زندگی مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ صرف ایک برس میں میرے چہرے پر دو سفاک آنکھیں رہ گئی ہیں جو صرف یہ دیکھتی ہیں کہ مریض کی سانس چل رہی ہے یا نہیں وہ کان رہ گئے ہیں جو فقط یہ سنتے ہیں کہ مریض کا دل دھڑکتا ہے یا نہیں، وہ زبان رہ گئی جو لوگوں کو بتا سکے کہ ان کا مریض زندہ ہے یا نہیں۔ میں اپنے ہی سینے میں گھُٹ کر مر رہا ہوں میں اپنے یہ دانتوں تلے دب رہا ہوں اور میں اپنے ہی جسم تلے کچلا جا رہا ہوں۔ خُرّم مر رہا ہے۔ ■

میرے وطن کے بچے

محمد عمر احمد خان

صبحیں مرے وطن کی روشن ہیں اِن کے دم سے
شامیں مرے وطن کی زندہ ہیں اِن کے دم سے
خوشبو چمن میں پیدا ہوتی ہے اِن کے دم سے
خوشیاں ہیں ان کے دم سے، رونق ہے اِن کے دم سے
بچّے ہیں یہ وطن کے، آتا ہے پیار ان پر
ہیں میرے دست و بازو، دل ہے نثار ان پر

معصوم ان کی صورت، ابّو کے ہیں یہ پیارے
رنگین بزم ان سے، لگتے ہیں یہ ستارے
یہ ننھے مُنّے بچّے، امّی کے دل کے پارے
جھلسا ہوا ہے لیکن چہرہ ستم کے مارے
بچّے ہیں یہ وطن کے، آتا ہے پیار ان پر
ہیں میرے دست و بازو، دل ہے نثار ان پر

یہ ننھے مُنّے بچّے، برتن جو دھو رہے ہیں
معمولی اجرتوں پر کپڑے جو سی رہے ہیں
سنتے ہیں ڈانٹ سب کی اور مسکرا رہے ہیں
حالِ زبوں سے اپنے مجھ کو رُلا رہے ہیں
بچّے ہیں یہ وطن کے، آتا ہے پیار ان پر
ہیں میرے دست و بازو، دل ہے نثار ان پر

پیار و خلوص کا ہے ان سب سے رشتہ میرا
شاید انھیں میں گم ہے اک بچّہ مسکراتا
میں اس کو ڈھونڈتا ہوں بچپن ہے جس میں میرا
اپنا لیا ہے اس نے شاید میرا سراپا
بچّے ہیں یہ وطن کے، آتا ہے پیار ان پر
ہیں میرے دست و بازو، دل ہے نثار ان پر

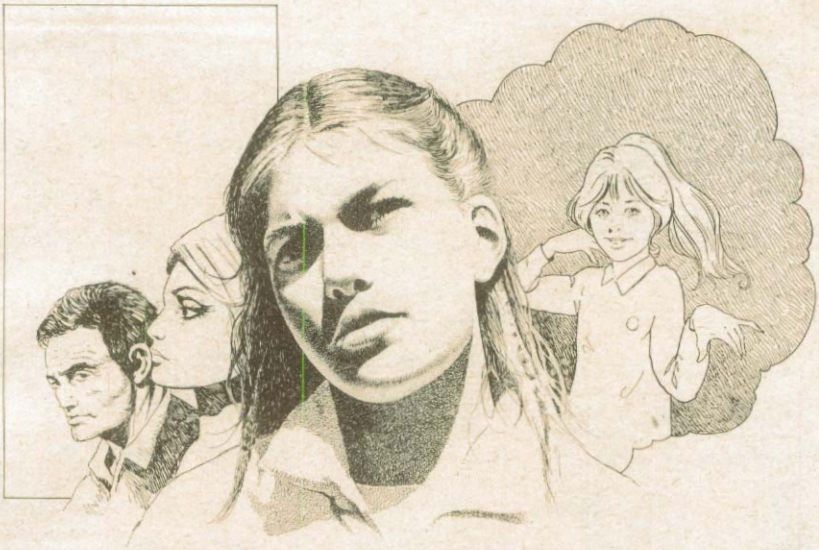

میں بھی تو آپ کی بیٹی ہوں

بچّوں کے ساتھ کسی بھی وجہ سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا

صائقہ دلدار

سمیعہ اور سُمیرا دونوں بہنیں تھیں۔ دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ سمیرا انتہائی شوخ چنچل اور کلاس کی بہترین طالبہ تھی۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ سمیعہ بھی شوخ نہ سہی مگر لائق ہوتی، لکھنے پڑھنے میں اچھی ہوتی۔ پر ایسا نہ تھا۔ کلاس کی اگر نالائق لڑکی کوئی تھی تو سمیعہ ہی تھی۔ چونکہ یہ دونوں میرے ہی اسکول میں پڑھتی تھیں اس لئے ان دونوں بہنوں سے میری دوستی تھی اور میں انہیں اچھی طرح جانتی تھی۔ مگر یہ بات اسکول میں کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ..... سگی بہنیں ہوتے ہوئے بھی دونوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟ سمیرا تیز و طرار کیوں ہے اور سمیعہ کند ذہن اور کاہل کیوں ہے؟ وہ دونوں آٹھویں کی طالبہ تھیں۔ اپنی پر تجسس طبیعت کی وجہ سے مجھ سے نہ رہا جاسکا اور

میں نے ایک دن سمیعہ کو فرصت میں پکڑ لیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس سے پوچھ ہی لیا۔ اس نے لاکھ ٹالنا چاہا مگر پھر اسے بتانا ہی پڑا۔ اس نے مجھے جو کچھ بتایا، میں وہ باتیں اسی کی زبانی لکھ رہی ہوں۔" میں اور سُمیرا ہم اپنے ماں باپ کی دو ہی بیٹیاں ہیں مگر عادات اور شکل و صورت میں بے حد فرق ہونے کی وجہ سے ہم آپس میں بہنیں نہیں لگتیں۔ سُمیرا زیادہ خوبصورت اور پیاری ہے۔ اسی لئے امّی ابّو شروع ہی سے اسے اہمیت دیتے آئے ہیں۔ وہ ہر کسی کے سامنے میرے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری بیٹی لگتی ہی نہیں۔ شروع شروع میں جب میں کبھی شرارت کرتی تو امّی کہتیں کہ تم ہماری بیٹی نہیں ہو۔ ہم تو تمہیں ہسپتال سے غلطی سے اُٹھا لائے تھے اور تم زیادہ شرارت کرو گی تو ہم تمہیں واپس وہیں چھوڑ آئیں گے۔ ممکن ہے وہ یہ باتیں مذاق میں کہتی ہوں لیکن مجھے ان کی باتوں سے بہت تکلیف پہنچتی تھی اور ان کی باتیں سُن کر اکیلے کمرے میں چھُپ کر رونے لگتی تھی اور کبھی کبھی اللہ میاں سے دعا مانگنے لگتی تھی کہ وہ مجھے میرے اصلی ماں باپ سے ملا دے۔ لیکن اللہ میاں نے کبھی میری دُعا نہیں سُنی"۔ یہاں تک کہنے کے بعد سمیعہ اداس ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ "سمیعہ! تم لکھنے پڑھنے میں دل کیوں نہیں لگاتیں اگر تم محنت کرو گی تو امّی ابّو تمہیں بھی پیار کرنے لگیں گے!" سمیعہ نے کہا۔ "بے شک اب نالائق ہوں مگر شروع میں ہمیشہ فرسٹ آتی تھی۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ کوئی بھی میری طرف توجہ نہیں کرتا تو میرا دل بُجھ گیا...... اور میں نے بھی ان سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ میں نے پڑھائی کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی۔ امتحانات آتے ہیں تو جیسے تیسے کر کے پاس ہو جاتی ہوں"۔ میں نے پوچھا "سمیعہ ! کہیں تم ان کی سوتیلی بیٹی...... میرا مطلب ہے۔" میری بات کاٹ کر وہ بولی۔

"نہیں تو۔ میں اور سمیرا دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ جڑواں بچّے آپس میں بے حد ملتے جلتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ تو ایسا نہیں ہے"۔ میں نے دیکھا کہ اگر چہ وہ حوصلے سے یہ سب بتا رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خود میں بے حد اُداس ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں سمیعہ کو کیسے تسلی دوں۔ آخر وہ بھی تو اپنے والدین کی بیٹی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح سُمیرا تھی تو پھر سمیعہ کے امی اور ابّو کیوں بھول جاتے ہیں کہ تمام بچّے یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ شکل و صورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہوتی ہے اور عقل سمجھ بھی پیدائشی ہوتی ہے۔ بعض بچّے بچپن ہی سے ہوشیار ہوتے ہیں اور بعض شروع ہی سے سست ہوتے ہیں۔ اس میں بچّوں کا تو کوئی قصور نہیں ہوتا بلکہ ماں باپ توجہ دیں تو کُند ذہن بچّے بھی تیز ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انھیں حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے اگر والدین ہی اپنے بچوں کے حقوق کا خیال نہ کریں گے تو

بچے کی شخصیت تو مسخ ہو جائے گی اور ہر بچی سمیعہ کی طرح مایوسی ہو جائے گی۔ میں نے سمیعہ سے پڑھائی کی طرف توجہ دینے کے لئے کہا اور وعدہ کیا کہ میں اس کے امّی ابّو سے بات کروں گی۔ لیکن بعد میں میں نے سوچا کہ سمیعہ کے امّی ابّو میری باتوں کو اہمیت دیں گے؟ ہمارے ملک میں کتنے ہی والدین ایسے ہیں جو اپنے ایک بچے کو دوسرے بچوں پر فوقیت دیتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے دوسرے بچّوں کی حق تلفی کرتے ہیں۔ اگر والدین ایسا نہ کریں تو ہر بچی سُمیرا ہو۔ شوخ چنچل اور ذہن...... خواہ کچھ ہو...... میں سمیعہ کی امّی سے ضرور بات کروں گی...... میں انہیں بتاؤں گی کہ سمیعہ اُداس کیوں رہتی ہے۔ شاید وہ میری بات سمجھ جائیں اور سمیعہ کو پیار سے گلے لگا لیں اور سمیعہ آنسوؤں بھری آنکھوں سے مسکرا اٹھے۔

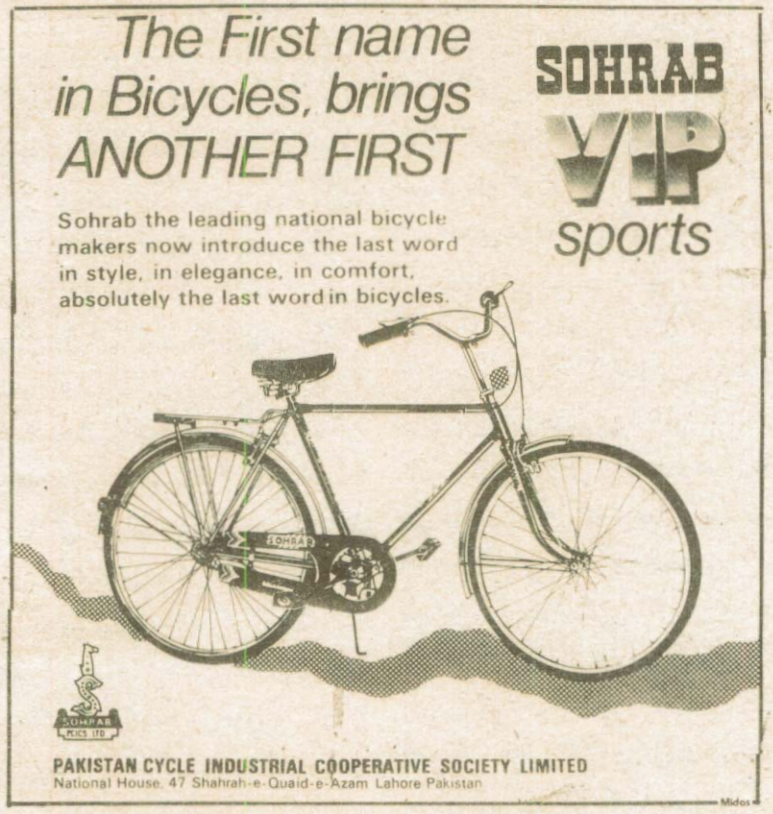

بچوں کے بیوپاری
اونٹوں کے شکاری

شیخ تاج محمد

> حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ بچوں کو زبردستی اغوا کرنے، انہیں دوسرے ملکوں میں پہنچا دینے اور ان کی خرید و فروخت جیسے مکروہ کاروبار کا خاتمہ کرے۔

بچے اس دنیا کی سب سے خوب صورت نعمت ہیں جو اللہ تعالیٰ نے والدین کو عطا کی ہے۔ لیکن بہت سے والدین اللہ کی اس پیاری نعمت کی قدر نہیں کرتے۔ اپنے بچوں کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ نہیں کرتے۔ جس توجہ، دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کی انہیں ضرورت ہوتی ہے، وہ اسے پورا نہیں کرتے۔

غربت بھی اس دھرتی کا سب سے بڑا المیہ ہے لیکن اس سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ کچھ والدین یا ان کے سرپرستوں کے دل اتنے سخت ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ننھے بچوں کو چند "ریال" کی لالچ میں بیچ دیتے ہیں۔ ان چند "ریال" سے ان کا مستقبل "سنہرا" نہیں ہوتا اور ان کے ننھے بچے کی زندگی بھی "زندگی کی ریس" کی طرح ہار جیت کے داؤ پر لگی رہتی ہے۔

دھرتی ایسے ظالم لوگوں سے بھی بھری پڑی ہے جو بچوں کا کاروبار کرتے ہیں اور انہیں شرم ناک مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بچوں کے یہ اسمگلر زیادہ تر پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت سے تعلق رکھتے ہیں۔

بچوں کے ان اسمگلروں کا اونٹوں کے شکاریوں سے رابطہ ہوتا ہے۔ اونٹوں کے بے رحم شکاری خلیجی ممالک کے وہ شیوخ اور امیر زادے ہیں جو

بچّوں کو ان بیوپاریوں سے خرید لیتے ہیں یا ملازم رکھتے ہیں اور پھر ننھے منے معصوم بچّوں کو "اونٹ دوڑ" میں بحیثیت "جیکی" (ہلکا سوار) استعمال کرتے ہیں۔

اونٹوں کی ان ریسوں میں ہزاروں روپوں کی شرطیں لگائی جاتی ہیں۔ یہ "اونٹ دوڑ" عام طور پر خلیج کے ممالک، قطر، عمان، شارجہ، دبئی، بحرین، کویت اور سعودی عرب میں ہوتی ہیں۔

بچّوں کے بیوپاری غریب والدین کو خلیج کے ممالک کی اندھی کمائی کا لالچ دے کر بچّے ان سے حاصل کر لیتے ہیں یا خرید لیتے ہیں اور پھر انہیں خلیج کے ممالک اسمگل کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں مکران کے ۴۵۰ کلو میٹر کے طویل ساحل پر واقع "پسنی"، "گوادر"، "جیوانی" اور "ارمارہ" سے لانچوں کے ذریعے غیر قانونی طور پر بچّوں کو اسمگل کیا جاتا ہے۔ اسمگل ہونے والے بچّوں کا تعلق زیادہ تر رحیم یار خان، خان پور، دادو، تھرپارکر، اور کراچی کے علاقے لیاری سے ہوتا ہے۔

پولیس نے گذشتہ دنوں سات ایسے بچّوں کو بر آمد کیا جنہیں دبئی اسمگل کیا جانا تھا۔ ان بچّوں کی عمریں ڈھائی برس سے چھ برس کے درمیان ہیں۔ محمد یونس ولد محمد عارف اور ببلو ولد کریمہ کی عمر ساڑھے تین سال، سرور ولد جمعہ، غلام رسول ولد محمد حسین اور وزیر ولد ہیراجی کی عمریں چار سال اور بکو ولد کریمہ چھ سال کا ہے جب کہ وجے ولد ڈاڈو جی ڈھائی سال کا معصوم سا ننھا مُنا بچّہ ہے جو ابھی فیڈر سے دودھ پیتا ہے۔

وکلا برائے انسانی حقوق و قانونی امداد (LHRLA) کے صدر ضیا احمد اعوان نے اس سلسلے میں تربت (بلوچستان) کا دورہ کیا اور ان بچّوں سے تفصیلات جمع کیں۔

ایک بچّے نے بتایا کہ انہیں لانچ پر سوار کیا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے لانچ خراب ہو گئی جس کے بعد انہیں پسنی میں ایک زمین دار کے گھر ٹھہرایا گیا جہاں پولیس نے چھاپہ مار کر انہیں بر آمد کیا اور دس افراد کو گرفتار کر لیا۔ ان دس افراد میں سے چھ تو بچّوں کے والد ہیں اور ایک بھائی ہے، جب کہ باقی تین افراد میں دو لانچ کے مالک اور ایک ڈرائیور ہے۔ گرفتار ہونے والوں کے نام بمعہ ولدیت یہ ہیں۔

ڈاڈو جی والد سالو، پپو ولد کریم بخش، محمد عارف ولد بادل خان، محمد حسن ولد رحمت علی، کریما ولد برائران، جمعہ والد پنو، ہیراجی ولد لیکوجی، رسیہ ولد موسیٰ، عبدالرحیم ولد محمد اور نبی بخش ولد قادر داد۔

اس سے پہلے دو بچّوں عبدالحفیظ اور عبدالغفار کو بر آمد کیا گیا تھا جن کو پانچ افراد کا ایک گروہ اسمگل کرنے جا رہا تھا۔ ۱۹۹۲ء کے شروع میں تقریباً بتیس (۳۲) بچّے جن کی عمریں تین سے سات برس کے درمیان تھیں، مکران کے ساحلی علاقوں سے خلیجی ممالک اسمگل کئے گئے۔ مکران پولیس بچّوں کو تو بر آمد نہ کر سکی لیکن اس پبلک بس کے ملک،

ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئی جنہوں نے بچّوں کو ساحلی علاقے تک چھوڑا تھا۔ ان افراد کو بچّوں کے اغوا کے مقدمے میں تربت سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

ضیا اعوان نے یہ بھی بتایا کہ کچھ عرصہ قبل کراچی ائیر پورٹ سے دبئی جانے والے چار بچّوں کو ایف آئی اے (وفاقی تحقیقاتی ادارے) نے بر آمد کیا جن میں سے دو سگے بھائی ہیں۔ یہ بچّے ایک بار خلیجی ملک جا چکے تھے جبکہ دوسری بار اپنی ماموں کے ساتھ جا رہے تھے تو پکڑے گئے۔ ان بچّوں کے نام بمعہ ولدیت یہ ہیں۔

اعجاز ولد اسماعیل، لیاقت ولد اسماعیل، سومار ولد غلام قادر اور خان محمد ولد غلام قادر۔

ان بچّوں نے بتایا کہ انہیں اونٹوں پر ریسوں کے جال سے باندھ دیا جاتا اور اونٹوں کو دوڑایا جاتا۔ اس قسم کی دوڑ پر بڑے پیمانے پر شرطیں لگائی جاتیں۔ بچّوں کے بیان کے مطابق انہیں ہر ماہ بارہ سو ریال (۱۲۰۰) دیئے جاتے تھے جن میں سے بیشتر اسمگل کرنے والے ہضم کر جاتے۔ بچّوں کو رہنے کے لئے اونٹوں کے اصطبل کے قریب جگہ دی جاتی اور ہفتے میں ایک بار انہیں شہر کی سیر کے لئے لے جایا جاتا۔ بچّوں کا کہنا ہے کہ ریس کے دوران کئی بچّے گر جاتے، جن میں سے اکثر مر جاتے اور کئی بچّے اپنے ہاتھ پیر تڑوا بیٹھتے ہیں۔

پڑوسی ملک بھارت میں بھی بچّوں کی اسمگلنگ کا کاروبار بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ بچّوں کے اسمگلر غریب خاندانوں سے بچّے خرید کر خلیجی ممالک اسمگل کر دیتے ہیں۔

گذشتہ دنوں نئی دہلی کے ہوائی اڈے سے دو مشتبہ بنگلہ دیشی افراد محمد عالم اور محمد باسط پکڑے گئے جن کے ساتھ دو بچّے بھی تھے۔ ان سے پوچھ گچھ کے بعد دہلی کے محلّہ "نظام الدین" میں واقع ایک گھر پر چھاپہ مارا گیا تو وہاں سے مزید تین بچّے اور چھبیس (۲۶) عدد پاسپورٹ بھی بر آمد ہوئے۔ یہ

وہ مظلوم بچے جو اونٹ کے کھیل میں حصہ لینے کے لئے بیچ دیئے گئے۔

بھی پتہ چلا کہ ان بچوں کو دبئی میں امیر لوگوں کو فروخت کیا جاتا تھا جو انہیں "اونٹ دوڑ" میں استعمال کرتے۔

پچھلے سال اپریل میں بمبئی پولیس نے بائیس (۲۲) بنگالی بچوں کو خلیج اسمگل کرنے کی کوشش ناکام بنائی۔

"ان ننھے منے بچوں کو ہی "اونٹ دوڑ" میں کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ کیا بڑے لوگ دوڑ کے اونٹوں پر نہیں بیٹھ سکتے؟" اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک صحافی نے (جو خلیج کے ممالک کے دورے کر چکا ہے) بتایا ہے کہ "اونٹ جیکی" کے لئے دو خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ وزن میں ہلکا ہو دوسرے اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکلیں جو اونٹ کو دہشت زدہ کر کے بھاگنے پر مجبور کر دے۔ خلیج کے چند عربوں کے بیان کے مطابق اس سلسلے میں معیاری چیخیں تین سے دس برس کی عمر کے درمیان کے بچوں کی ہوتی ہیں، جنہیں اونٹ کے ہودے پر باندھ دیا گیا ہو۔ عرب شیخ کہتے ہیں کہ "اگر اس بچے نے اپنی زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار اونٹ دیکھا ہو تو ریس جیتنے کے لئے یہ اور بھی اچھا ہے۔" بچہ جب چیختا ہے تو اونٹ اسے گرانے کی کوشش کرتا ہے جس کے سبب رسی ڈھیلی ہو جاتی ہے اور بچہ اونٹ کی پچھلی ٹانگوں کے درمیان لٹک جاتا ہے یا پھر نیچے گر کر ریت اور پتھروں پر اونٹ کے پیچھے پیچھے گھسیٹتا چلا جاتا ہے۔ یہ تماشا امیر لوگ دیکھتے ہیں اور اس منظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کتنے سنگدل ہیں وہ ماں باپ جو چند ریال کی خاطر اپنے پھول جیسے بچوں کو موت کے حوالے کر دیتے ہیں، کتنے ظالم ہیں وہ بیوپاری جو بچوں کا کاروبار کرتے ہیں، اور انسانیت سے کتنے گرے ہوئے ہیں خلیج کے وہ شکاری جو معصوم بچوں کا شکار کھیل کر لطف حاصل کرتے ہیں!!! کیا وہ پیارے نبیؐ کا سبق بھول گئے ہیں جو آپؐ نے جگہ جگہ بچوں سے محبت و شفقت کا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا ہے ...... !!!

ارشادِ باری تعالیٰ

تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی،
اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمھارے
پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر
رہیں تو اِنھیں اُف تک نہ کہو، نہ اِنھیں جھڑک کر
جواب دو۔ بلکہ اِن سے احترام کے ساتھ بات
کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ اِن کے سامنے جھک کر
رہو اور دُعا کیا کرو کہ پروردگار اِن پر رحم فرما۔ جس طرح
اِنھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن
میں پالا تھا۔

(بنی اسرائیل ۲۲ تا ۲۳)

عطیہ اشتہار

حاجی فتح محمد میموریل آرگنائزیشن

۷۔ حسن لشکری اسٹریٹ، بادشاہی روڈ کراچی
۸۷ بلاک نمبر ۷، خانیوال

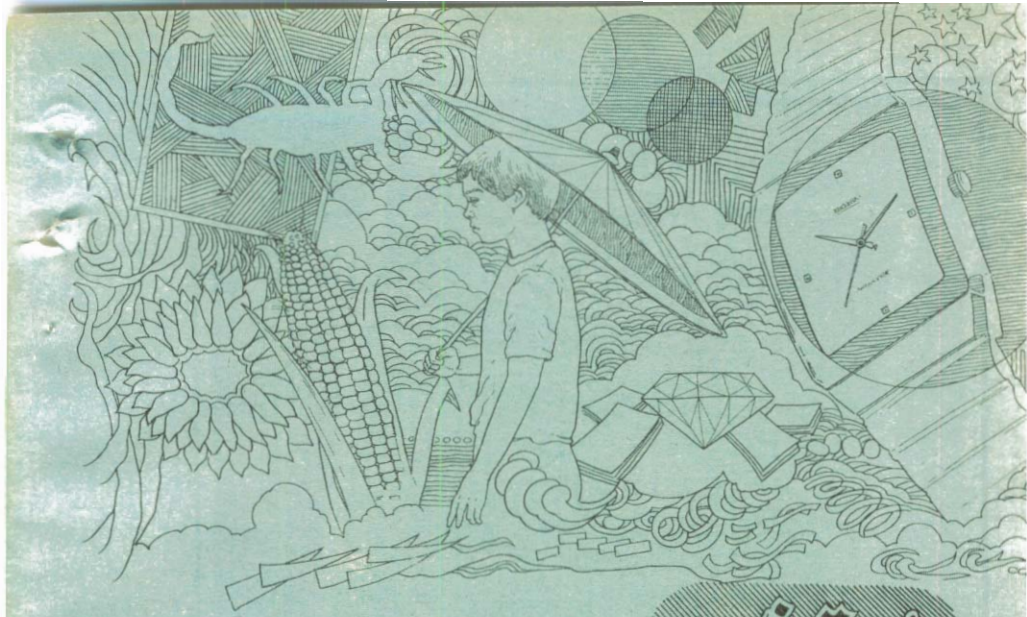

بوجھو تو جانیں

ادارہ

مرسلہ:۔ محمد عمران احمد، کراچی

عثمان غنی آدم سومار، کراچی

۱۔ آگے سے وہ گانٹھ گٹھیلا پیچھے سے وہ ٹیڑھا
ہاتھ لگائے قہر خدا کا بوجھ پہیلا میرا

۲۔ خواہش اس کی سب لوگوں کو محفل میں وہ آتا ہے
پیٹ پُھلائے جاتا ہے اور سب کا اُگلا کھاتا ہے

۳۔ دو سہیلی ایک مکان چلیں پھریں بولیں ہر آن
ہاتھ نہ پاؤں آنکھ نہ کان وقت بتائیں او نادان

۴۔ آگے آگے بہنا آئی پیچھے پیچھے بھیّا
دانت نکالے باوا آئے برقعہ اوڑھے میّا

۵۔ گول مول اور چھوٹا موٹا ہر دم وہ زمین پہ لوٹا
خسرو کہے یہ نہیں ہے جھوٹا جو نہ بوجھے عقل کا کھوٹا

۶۔ لیک بیٹی لیک امّی جان روز پکاتی ہیں پکوان
امّی تو ہر چیز چھپائے بیٹی سب کو بانٹ کھلائے

۷۔ لیک نار کی چال ہے جھوٹی بے سر کاٹے رہے وہ روٹھی
جب کریں منہ اُس کا کالا کام بنائے سب سے اعلیٰ

۸۔ لیک شخص میں پھرتا دیکھوں کہہ اے بابو جوگی ہوگا
نہیں گورو جی ماتھے سُوت کہہ اے بابو جُلاہا ہوگا
نہیں گورو جی منہ میں لوہا کہہ اے بابو گھوڑا ہوگا

۹۔ پہلے پانی اسے پلاؤ پھر مُکّوں سے شامت لاؤ
تن پر جب سوجن آئے پھر وہ اور طمانچے کھائے

۱۰۔ لیک درخت عجیب دیکھا ڈال گھنے دکھلائے لیک پتا اس کے اوپر ہاتھ چھوئے کمہلائے
عمدہ اس کا سایہ ہے اور سندر اس کا روپ کھلا رہے اور نہ کمہلائے جوں جوں لاگے دھوپ

۱۱۔ آگ لگے میرے ہی بل پر ہر انسان کے آؤں کام
دن میں پودے مجھے بنائیں اب بتلاؤ میرا نام

گزشتہ ماہ کی پہیلیوں کے درست جوابات:۔

(۱) قبرستان (۲) ازار بند دانی (۳) گھڑی (۴) دروازے کے پٹ (۵) موم بتی (۶) بیٹا بیٹی
(۷) نام (۸) ہار (۹) کیلا (۱۰) گنے کا رس نکالنا

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے ساتھی۔

۱۔ محمد نذیر، سرگودھا ۲۔ نعیم احمد پاشا، سرگودھا ۳۔ شفقت علی شاہین، سرگودھا۔

بالکل درست جواب دینے والے ذہین ساتھی:۔

قیصر اقبال، محمد علی سفیر، محمد کامران ایوب، حماد علی فیصل، کراچی۔ ایاز حسین ریاض، راولپنڈی۔ آصف علی خان، رانا شکیل احمد، کامونکی۔ شگفتہ رانی، راولپنڈی۔ طاہر نعیم راجو، راولپنڈی۔ حمیرا تبسم، ٹھٹھہ۔ حاجی شہزاد حسین اعوان، ملتان۔ سید انوار، لاہور۔ محمد فیاض، لاہور۔ محمد عمران، لاہور۔ سحر ریاض، راولپنڈی۔ سعید محمد اصغر عباس نقوی، اسلام آباد۔ سلیم خالق، کراچی۔ محمد سرفراز، حیدر آباد۔ حنا ملک، ذیشان ملک، ریحان ملک، ارم ملک، لاہور۔ عبد الستار خان طاہر، بورے والہ۔ وقار احمد، نوید احمد نومی، عبداللہ خورشید، ہری پور۔ محمد عمران، لالہ موسیٰ۔ محمد ثاقب حبیب، حیدر آباد۔ خلیل احمد تبسم، باغ و بہار۔ محمد اویس امین، لاہور۔ رانا محمد طاہر، شیخوپورہ۔ دانش حسین، حیدر آباد۔ غلام عباس طاہر، مہر احمد نواز لیل، کوثر یاسمین لیل، شور کوٹ۔ اصغر علی شاد، لطیف احمد، حنیف احمد، اکبر، سرگودھا۔ فرحین ابرار (؟) نوید احمد، کراچی۔ ناہید اختر، لاہور۔ عافیہ طاہر خان، سرگودھا۔ نواب علی پریمی، سانگھڑ۔ ارسلان احمد بھٹی، عطاالرحمٰن بھٹی، کھپرو۔ سلمان الٰہی، کراچی۔ عمران نواز، جہلم۔ سیّدہ تابندہ حسنین، لاہور۔ محمد آصف شریف، محمد عمران شریف، محمد عارف شریف، محمد رضوان شریف، محمد یعقوب، محمد سلیم، محمد شبیر، محمد عمر عظیم، اقرا نورین، مہرین اختر، عشرت علی، نصرت علی، جہانگیر علی، نصیر احمد، منیر احمد، محمد شریف، نور محمد، محمد اصغر، خالد اقبال چوہدری، شاہد اقبال چوہدری، ظفر اقبال چوہدری، مقبول احمد شاہین، اعجاز احمد شاہین، حافظ رفاقت علی، طاہر اقبال چوہدری، علی بہادر چوہدری، زاہد اقبال چوہدری، تنویر احمد پاشا، شاہد تاثیر، محمد ساجد تاثیر، عابد تاثیر، حفیظ الرحمٰن، محمد عدنان جمی، محمد ذیشان شانی، محمد سعید، محمد رضا، محمد غلام فرید، جاوید اقبال، نوید اقبال، فرید اقبال، ناہید اقبال، محبوب علی شاکر، منظور علی شاکر، منصور علی شاکر، محمد علی شاکر، سرگودھا۔ محمد نبیل امتیاز، راولپنڈی۔ نزہت نواز جسکانی، کراچی۔ عماد فاروق خان، سکھر۔ عائشہ شیخ، کراچی۔ سیّد محمد علی رضا، لاہور۔ احمد حسن صدیقی، کراچی۔ سعید الرحمٰن، بھکر۔ بشریٰ زیدی، راولپنڈی۔ جنید صدیقی، حیدر آباد۔ ابیل اختر، لاہور۔ سیما عقیل راجپوت، شبنم عقیل راجپوت، حیدر آباد۔ سلیم رضا، احسان الرحمٰن خالد، لاہور۔ محمد زمان وسان، سانگھڑ۔ محمد عاطف صدیقی، کراچی۔ عاشق حسین ابڑو، حیدر آباد۔ نازیہ شریف، محسن شریف، سکھر۔ عظمیٰ عبدالرحمٰن، حیدر آباد۔ رحیم عباس، بھکر۔ خیزران طاہرہ، لودھراں۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھی:-

محمد منیر احمد، منصور عظیم، کراچی۔ محمد وقاص، حیدر آباد۔ فرح نعمان فراز، مریم فاطمہ بھوپالی، روح اللہ، کراچی۔ سیّد جودت علی جعفری، حیدر آباد۔ صبیحہ میر، موسیٰ، اٹک۔ عابد رشید، انعم آصف، محمد کامران آصف، لاہور۔ سعدیہ ملک، خوشاب۔ فراز فہیم، کراچی۔ محمد آصف، حیدر آباد۔ محمد جاوید، جھنگ۔ محمد زاہد، حیدر آباد۔ محمد محفوظ احمد، جہلم۔ وقار الدین، گجرات۔ محمد سلیم انصاری، پسرور۔ شاہد نوید، گجرات۔ کاشف ریاض، لاہور۔ محمد اشرف، کمالیہ۔ چوہدری افتخار احمد خضر، جھنگ۔ احمد حسان چوہدری، ملتان۔ سجاد محمد خان، حیدر آباد۔ کاشف محمود، گوجرانوالہ۔ اسما امان، کراچی۔ ساجد کمالوی، کمالیہ۔ سید حسن علی، سکھر۔ سہیل عامر خان، فیصل آباد۔ فوزیہ ظفر، حیدر آباد۔ عنبرین گلزار علی، کراچی۔ شازیہ فاطمہ، سکھر۔ نواب مراز کرن بیگ، نواب مرزا دلاور بیگ، نواب مرزا زوار بیگ، نواب مرزا زور آور بیگ، نواب مرزا ماہین بیگ، اسلام آباد۔ حافظ سید یاسر حسین تقوی، کراچی۔ ابتسام ساجد، کمالیہ۔ راؤ شاہد اقبال، نواب شاہ۔ چوہدری محمد قاسم گورایہ، چوہدری حماد الرحمٰن گورایہ، زر افشاں گورایہ، رضوان احمد گورایہ، گوجرانوالہ۔ نوشین مختار رانا، رحیم یار خان۔ محمد طاہر جمیل ، کراچی۔ غلام طٰسین خان نیازی، جڑانوالہ۔ محمد یوسف، ملتان۔ آغا عمران مرزا، آغا ماریہ ثروت، آغا عدیل مرزا، آغا ذیشان مرزا، آغا فیصل مرزا، کوٹری۔ شہلا حسین، واہ کینٹ۔ بدر الحسن صدیقی، فیصل آباد۔ افتخار احمد شیرازی، ٹنڈو آدم۔ روزینہ قیصر حمید، کراچی۔ رفاقت اللہ یوسف زئی، ڈی آئی خان۔ حنا خان، کراچی۔ بریرہ سحر، رحیم یار خان۔ شاہد لودھی، سکھر۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ محمد فہیم منصور سانگھڑ۔ محمد اسلام، اسلام آباد۔ ولی محمد، سانگھڑ۔ محمد منیر مسعود، ملتان۔ ارم فاطمہ، سکھر۔ سید محمد طیب، کراچی۔ مرزا عمران بیگ، مرزا کامران بیگ، مرزا ریحان بیگ، مرزا فرقان بیگ، مرزا عدنان بیگ، مرزا فرحان بیگ، مرزا سلمان بیگ، مرزا کرن بیگ، حیدر آباد۔

ایک سے زیادہ غلط جواب دینے والے ساتھی:-

برکت علی ہزارہ، سانگھڑ۔ علی احمد سلیم، کراچی۔ شاہد حسین میمن، شیرین میمن، کراچی۔ ارشد علی ارائیں، شکار پور۔ سہیل اظہر بٹ، گوجرانوالہ۔ راشد مناس ثاقب، قصور۔ فاریہ تقدیس، اٹک سٹی۔ نعمان طارق خان، حضرو۔ ثنا اختر قریشی، محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ رضوان احمد خان نیازی، بھکر۔ زاہد واسطی، شگفتہ واسطی، راشد واسطی، ارشد واسطی، فرحت واسطی، شہزاد واسطی، جواد واسطی، ادیبہ واسطی (؟) محمد راحیل بن یحییٰ، حیدر آباد۔ رفیق اکبر، حیدر آباد۔ فیصل رفیع مغل (؟) مبشر فیروز، اسلام آباد۔ محمد اشرف اصغر، رحیم یار خان۔ یوسف فاروق، رسالپور۔ محمد ارشد، گجرات۔ افشاں منصور، کراچی۔ فوزیہ کراچی۔ انتہیٰ حسنات، کمالیہ۔ محمد عثمان خانزادہ، کراچی۔ گل زرین خان، ایبٹ آباد۔ اکرم پاشا میمن، ٹھٹھہ۔ عمران بشیر، کراچی۔ سید عدیل حیدر شاہ۔ خوشاب۔ محمد امیر خان، محمد امجد قریشی، کراچی۔ چوہدری فخر عباس، سرگودھا، محمد شکیل بھٹو، دادو۔ نازنین سرفراز، سکھر۔ انیل کمار آزاد، راجو کھانانی۔ صائمہ کنول، عظمیٰ کنول، حیدر آباد۔ نعمان اقبال، بہاولپور۔ تزئین فاطمہ، راولپنڈی۔ افشاں غوری، حیدر آباد۔ مصباح صدف، خوشاب۔ عدنان احمد صدیقی (؟) عنبرین بودلہ، تسنیم بودلہ، پاک پتن شریف۔ محمد عثمان مسعود، اسلام آباد۔ رضوان سلمان قریشی، حیدر آباد۔ فہد عمران، کراچی۔ ضیا عباس، حیدر آباد۔ مجاہد حسین، کراچی۔ ندیم علی دانش، جہلم۔ عمیر اقبال، کراچی۔ حرا انوار، لاہور۔ رخشندہ عبدالرشید، راحیل رشید، احسن علی چنگیزی، نعمان احمد خان، اسامہ آصف حسن، صائمہ، کراچی۔ مریم بیگ، راولپنڈی۔

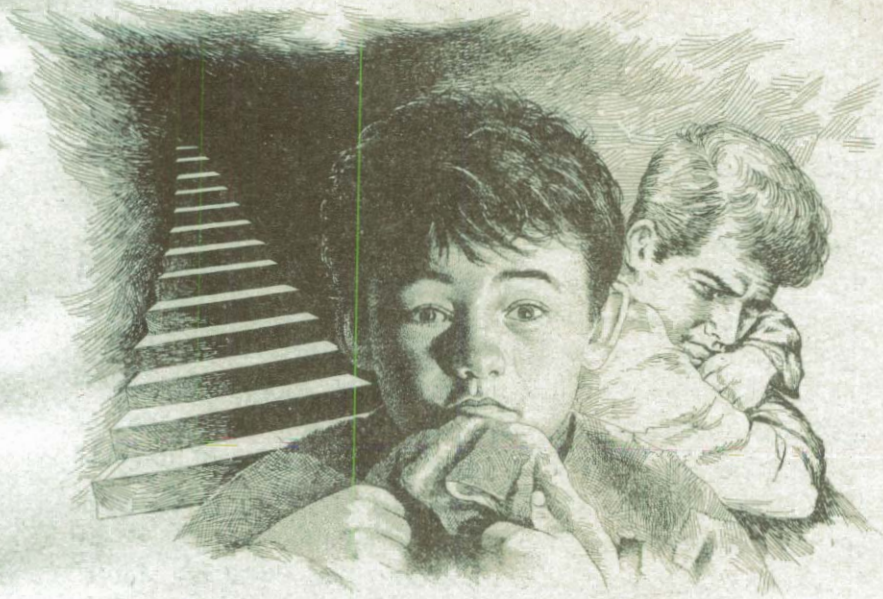

سچا واقعہ

بے سہارا

فاروق عادل

> جن بچوں کی دیکھ بھال نہ ہوتی ہو ان کی نگہداشت حکومت کی ذمہ داری ہوگی

اب سے کئی سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ان دنوں میں کرائے کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس رات سخت جاڑا تھا۔ میں رات گئے واپس لوٹا۔ اسکوٹر لاک کیا اور دانت کٹکٹاتا، اندھیرے میں ٹٹولتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر میں نے جیب سے چابی نکالی اور جیسے ہی آخری سیڑھی پر قدم رکھا، ایک دردناک چیخ بلند ہوئی لیکن یہ فوراً ہی گھٹ بھی گئی، جیسے چیخنے والے نے سہم کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا ہو۔ یقیناً یہ کسی بچے کی آواز تھی۔ میں تو تقریباً بدحواس ہو چکا تھا اور اگر دیوار کا سہارا نہ لیتا تو گر بھی پڑتا۔

اوسان بحال ہوئے تو میں نے ماچس جلا کر تیلی کی روشنی میں دیکھا، دروازے کے کونے میں چھ سات سال کا ایک بچہ سمٹا کھڑا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے بوری اوڑھ رکھی ہوگی جو

اب نیچے پڑی تھی۔ بچّہ سردی سے ہولے ہولے کانپ بھی رہا تھا۔ دفعتاً تیلی بجھ گئی۔ میں نے دروازہ کھولا اندر داخل ہو کر لائٹ آن کی اور ایک نظر سیڑھیوں پر ڈالی۔ بچّہ اسی طرح کھڑا تھا۔ شاید اپنے بارے میں کوئی حکم سننے کا منتظر تھا لیکن جب میں نے تھوڑی دیر تک کچھ نہیں کہا تو وہ مایوس ہو گیا اور اپنی بوری سمیٹ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ تب میں نے اسے آواز دی اور کہا کہ تم اوپر کمرے میں آکر سو جاؤ۔

وہ تھوڑا سا ہچکچایا اور پھر اوپر آگیا۔ ایسے مارے مارے پھرنے والے لڑکوں کو لوگ اپنے گھروں میں گھسنے نہیں دیتے، کیونکہ یہ موقع پاکر اکثر گھر صاف کر جاتے ہیں لیکن مجھے اس بچے سے کچھ ہمدردی ہو گئی تھی اور پھر باہر سردی بھی بے پناہ تھی۔ وہ اوپر آیا تو میں نے روشنی میں اسے غور سے دیکھا۔ اس نے میلے چکٹ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی کلائیوں، گردن اور چہرے پر میل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں میں نے اس کے میلے جسم اور میلے کپڑوں کو دیکھ کر سوچا کہ اسے بستر دوں یا نہ دوں لیکن پھر میں نے اسے ایک بستر دے دیا۔ بچّہ جھجکتے ہوئے بے یقینی کے انداز سے بستر میں گھس گیا اور سہمے ہوئے کبوتر کی طرح مجھے گھورنے لگا۔

مجھے رات کو دیر تک جاگ کر پڑھتے رہنے کی عادت ہے۔ میں نے حسبِ عادت کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ شاید وہ کوئی دلچسپ افسانہ تھا جسے پڑھنے میں اس قدر مشغول ہوا کہ ابھی ابھی پیش آنے والے سارے واقعات میرے ذہن سے نکل گئے۔ افسانہ ختم ہوا تو میری نظر پھر بچّے پر پڑی، وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم سوتے کیوں نہیں اس نے کوئی جواب نہ دیا، ٹکر ٹکر مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اس سے مزید کچھ سوال پوچھے، مگر اس نے کسی سوال کا بھی جواب نہ دیا اور میں نے بے زار ہو کر سونے کا ارادہ کیا اور لائٹ آف کر دی۔

روشنی گُل ہونے کے بعد بھی مجھے ایسے لگا گویا اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھے گھور رہی ہوں۔ وہ ایک انتہائی کم سن بچّہ تھا۔ اس کی عمر گھر سے ناراض ہو کر بھاگنے والی نہ تھی۔ پھر یہ بے گھر کیسے ہے؟ مجھے خود بخود ہی خیالات آنے لگے۔

شاید اس کے ماں باپ کسی حادثے میں مر چکے ہوں یا یہ اتفاقاً اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہو اور یہ ان کی اور وہ اس کی تلاش میں ہوں اور جگہ جگہ مارے مارے پھرتے ہوں، یا یہ کہ اسے کسی بردہ فروش نے اغوا کر لیا ہو اور یہ کسی نہ کسی طریقے سے ان کے چنگل سے بچ نکلا ہو۔ ان ہی خیالوں اور سوچوں کے دوران میں نیند کی وادیوں میں جا نکلا۔ معلوم نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ سرسراہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو چکی تھی اور سورج کی کرنیں دریچے کی درزوں سے جھانک رہی تھیں۔ سیدھے ہاتھ پر اپنے مہمان کے بستر کی طرف دیکھا بستر خالی تھا۔

میں نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ ایک دروازے کی درز میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ شاید وہ میرے جاگ اُٹھنے سے پہلے ہی باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ باہر جانے کا کوئی راستہ نہ پاکر وہ واپس بستر کی طرف آیا۔ بڑے آرام سے بستر کو تہہ کیا اور پھر خود ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں میں اٹھ بیٹھا تو بچّے نے مجھے مخاطب کیا "صاحب! مجھے جانے دو۔" گزشتہ رات کی چیخ کے بعد بچّے کی یہ دوسری آواز تھی جو مجھے سنائی دی۔ میں نے اس سے کہا کہ "پہلے منہ ہاتھ دھو کر آؤ پھر ناشتہ کے بعد چلے جانا۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ پھر گھنٹہ بھر تک میں اس کا انتظار ہی کرتا رہا۔ بچّہ غائب ہو چکا تھا۔ دن بھر کے مختلف کاموں میں مصروف رہ کر میں بچّے کو بھول گیا تھا۔ رات کو اسکوٹر کھڑا کر کے اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو مجھے گزشتہ رات کا واقعہ یاد آگیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ آج وہ لڑکا نہیں ہے۔ مگر تالا کھولتے ہوئے احساس ہوا کہ کوئی ہے۔ آنکھوں کے اندھیرے سے مانوس ہونے کی وجہ سے کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔ مجھے چمکتے ہوئے دو تارے سے نظر آئے۔ گویا لڑکا آج بھی موجود تھا۔ روشنی ہونے پر تصدیق ہو گئی۔ آج وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اس کے پاس آج بوری نہیں تھی، شاید وہ اسے صبح اندر کمرے میں ہی بھول گیا تھا۔ میرے کہے بغیر ہی اس نے دھیرے سے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ میں نے بستر کی طرف اشارہ کیا تو اس نے خود ہی بستر بچھایا اور لیٹ گیا۔ آج اس نے مجھے اپنا نام بھی بتایا اور اپنے بارے میں بھی کچھ باتیں بتائیں اس کی کہانی کچھ یوں تھی:

وہ سرگودھا سے دور ایک قصبہ جھاوریاں کا رہنے والا تھا، اس کا باپ فضول خرچ اور عیاش آدمی تھا۔ ایک روز وہ دوسری شادی کر کے اپنی نئی بیوی کے ساتھ کسی اور جگہ جا بسا اور اپنی بیوی اور بیٹے اور بیٹی کو ان کے حال پر چھوڑ گیا۔ اب یہ خاندان جس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، کچھ عرصہ تک بُری بھلی زندگی بسر کرتا رہا۔ پھر ایک شخص کا ان کے گھر آنا جانا ہوا۔ یہ آنا جانا ہی قیامت ہو گیا۔

ایک صبح جب وہ سو کر اٹھا تو وہ اکیلا تھا اس کی ماں اور بہن غائب تھیں۔ وہ صبح اس بچّے نے بغیر ناشتے کے گزاری۔ دوپہر بھی ایسی ہی گزری۔ لوگوں نے اسے اس کی ماں اور بہن کے بارے میں بتایا کہ انہیں ایک شخص اغوا کر کے لئے گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی ہے اور اب وہ کسی اور جگہ رہتے ہیں۔

لوگوں نے رحم کھا کر کچھ دن تو اسے کھانا وغیرہ دیا۔ پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب وہ گلیوں اور بازاروں میں گھوم پھر کر گری پڑی چیزیں اٹھا کر کھا لیا کرتا تھا اور بس اسٹینڈ میں لگے ہوئے نل سے پانی پی لیا کرتا اور جا کر اپنی جھونپڑی میں سو

رہتا۔ مگر اب وہ قصبے والوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہو چلا تھا۔ وہ جس طرف جاتا، لوگ اسے دُھتکارتے اور ڈانٹ کر بھگا دیتے۔ چنانچہ اس نے کہیں اور جانے کی ٹھانی اور وہ اِدھر اُدھر گھومتا گھماتا سرگودھا پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے کم از کم کھانے پینے کے معاملے میں کوئی دشواری نہیں رہی۔ اسے مختلف بازاروں میں سے اتنا گرا پڑا فروٹ مل جاتا جو اس کا پیٹ بھر دیتا تھا۔

لڑکے کی کہانی سن کر میں غمزدہ ہو گیا۔ میں سوچنے لگا ہمارے معاشرے میں ایسے کتنے مظلوم لڑکے ہوں گے جن کے ماں یا باپ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی زندہ ہو گا۔ اس کے باوجود دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوں گے۔ اگلی صبح وہ ناشتہ کر کے چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات میں لوٹ آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ خدا جانے اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا یا کوئی اور بات ہو گئی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے چند روز تک اسے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ مجھے کبھی نظر نہ آیا اور میں چاہنے کے باوجود اس کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ اس واقعے کو اب کئی برس ہو چکے ہیں مگر وہ میلا کچیلا لڑکا اور اس کی بھورے رنگ کی بوری مجھے ابھی تک یاد ہے لیکن نام بھول چکا ہے۔ میں اس کی شباہت گلی محلوں میں اور بازاروں میں بھیک مانگتے ہوئے بچّوں میں محسوس کرتا ہوں، مگر پہچان نہیں پاتا۔

■

اقوال زریں

○ محنت مزدوری کرنے والا ہاتھ اللہ کے بہت نزدیک ہوتا ہے۔

○ کسی شخص کو سنوارنا چاہتے ہو تو اسے بُرا مت کہو۔

○ ایک قوم اتنی ہی عظیم ہوتی ہے جتنے کہ اس کے اساتذہ۔

○ نپولین کا کہنا ہے کہ تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں عظیم قوم دوں گا۔

○ ستاروں کے ساتھ ناپنے سے انسان زمین پر گرتا ہے۔

○ ماں دنیا کی عظیم ترین ہستی ہے۔

○ آزادی کے نخلستان شہیدوں اور غازیوں کی سرزمین پر لہلہاتے ہیں۔

○ ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

○ گناہ پر ندامت گناہ کو مٹا دیتی ہے اور نیکی پر غرور نیکی کو برباد کر دیتا ہے۔

○ خواہش پرستی مہلک رفیق اور بری عادات زبردست دشمن ہیں۔

○ انسان کی قابلیت زبان میں پوشیدہ ہے۔
علم عمل کے بغیر اور عمل اخلاص کے بغیر بیکار ہے۔

○ عاقل دوسروں سے عبرت حاصل کرتا ہے اور دوسروں کے لئے عبرت نہیں بنتا۔

○ کشادہ دلی ایک ایسی نعمت ہے جو بغیر محنت کے حاصل ہوتی ہے۔

○ علم مال سے بہتر ہے کہ تمہاری حفاظت کرتا ہے جب کہ تم مال کی حفاظت کرتے ہو۔

مرسلہ ..... اشفاق احمد شیخ، شہداد کوٹ

عبدالقادر

یتیموں کی فریاد

نہ ہیرے نہ لعل و گہر مانگتے ہیں
محبت کی بس اک نظر مانگتے ہیں

کبھی ہم تھے ماں باپ کے چاند تارے
سسکتا ہمیں چھوڑ کر وہ سدھارے

کوئی اب جہاں میں ہمارا نہیں ہے
تڑپتے ہیں لیکن سہارا نہیں ہے

ہمیں خوار سمجھا ہے ہر آدمی نے
محبت سے دیکھا نہیں ہے کسی نے

نہ حالت ہماری کوئی پوچھتا ہے
نہ آنسو ہمارے کوئی پونچھتا ہے

کوئی سر پہ اب ہاتھ رکھتا نہیں ہے
ہمیں کوئی اپنا سمجھتا نہیں ہے

زمیں پر نہیں ہے ٹھکانہ ہمارا
بڑا دکھ بھرا ہے فسانہ ہمارا

ہیں قسمت میں بس ٹھوکریں در بدر کی
کہیں دن گزارا کہیں شب بسر کی

یوں ہی زندگی ہم نے اب تک گزاری
کوئی اپنی سنتا نہیں آہ و زاری

نہ کوٹھی، نہ بنگلہ، نہ زر مانگتے ہیں
فقط ایک چھوٹا سا گھر مانگتے ہیں

کوئی غمزدوں کا سہارا نہیں ہے — ذرا ساتھ دینا گوارا نہیں ہے
نہ احساں اٹھائے ہیں ہم نے کسی کے — نہ ہاتھوں کو پھیلایا آگے کسی کے
نہ تعلیم ہی اپنی تقدیر میں ہے — نہ کھیل اور تفریح میسّر ہمیں ہے
نہ پوچھو گزرتے ہیں دن رات کیسے — کماتے ہیں محنت سے دو چار پیسے
صفائی کوئی کار کی کر رہا ہے — کسی گھر میں پانی کوئی بھر رہا ہے
کوئی پیچ کستا ہے اسکوٹروں کے — اٹھاتا ہے نخرے کوئی موٹروں کے
کوئی ہوٹلوں میں لگاتا ہے صافی — کسی کا ذریعہ ہے قالین بافی
پسینہ بہا کر یوں ہی جی رہے ہیں — شب و روز خونِ جگر پی رہے ہیں
ستارے، نہ شمس و قمر مانگتے ہیں
مشقّت کا اپنی، ثمر مانگتے ہیں

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے
مگر ــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

★ ــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں
★ ــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے
★ ــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں
یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔
★ ــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں
★ ــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے　　سبزیاں شوق سے کھائیے　　ہمیشہ صحت مند رہئے

منجانب
جملہ اقسام کی چھپی ہوئی تھیلیاں اور شاپنگ بیگ تیار کرنے والا معروف ادارہ
جیلانی انڈسٹریل کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
F.312 سائیٹ کراچی۔ فون نمبر ۲۹۵۶۷۹،۸۹ - ۲۹۷۱۶۱ - فیکس ۴۱۳۴۴۸

اقوامِ متحدہ کی خدمت میں

ادارہ

دنیا بھر میں بچّوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔
چند مہینے کے اخبارات کی خبروں سے ایک انتخاب

بچّوں کے اعضا کا کاروبار

جینوا (ریڈیو رپورٹ) دنیا بھر میں لاکھوں بچّوں کے ساتھ خوفناک طریقے سے زیادتیاں کی جارہی ہیں اور ان کا استحصال کیا جارہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق کے خصوصی مندوب کی رپورٹ کے مطابق کم عمر بچّوں کو جسم فروشی پر مجبور کیا جاتا ہے، ان کے اعضا کا کاروبار کیا جاتا ہے اور اُنہیں گود لینے کی غرض سے فروخت کیا جاتا ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی ۷ مارچ ۹۳ء

جائداد کے تنازعہ نے بچے کی جان لے لی

کوئٹہ (این این آئی) قلات میں توک کے مقام پر دو افراد فقیر محمد اور فضل محمد نے چاقوؤں کے پے در پے وار کر کے تیسری جماعت کے طالب علم نور احمد کا سر تن سے جدا کر دیا اور موقع سے فرار ہو گئے۔ قتل کی وجہ جائیداد کی تقسیم اور پیر سخی رمضان کے مزار پر خیرات کا تنازعہ بتائی جاتی ہے۔ قاتل اور مقتول آپس میں رشتہ دار ہیں۔ پولیس نے ملزمان کے چچا کریم بخش کو گرفتار کر لیا۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۸ فروری ۹۳ء

بغیر چھت کے اسکول

بھوپال والہ (نامہ نگار) یہاں سے دو کلومیٹر دور چک چودھو کا گورنمنٹ پرائمری اسکول میں چھت نہ ہونے کے باعث طلبہ تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ جب آسمان پر بادل چھاتے ہیں تو اسکول میں چھٹی کرادی جاتی ہے۔ گاؤں والوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اسکول کی عمارت فی الفور تعمیر کی جائے۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۷ مارچ ۹۳ء

نمک مرچ کے لئے بچے کو جیل میں ڈال دیا

لاہور (اپ پ) لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس تنویر احمد خان نے پھالیہ میں محکمہ مال کے جیل میں متعدد بچوں کو غیر قانونی طور پر بند کئے جانے کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے ایک بچے خالد محمود کو رہا کر دیا اور او ایس ڈی کو ہدایت کی کہ اس جیل میں بند افراد کی فہرست مہیا کی جائے۔ جج نے اس طرح مبینہ طور پر قید کئے جانے کے اقدام کے قانونی جواز یا عدم جواز کے تعین کے لئے کیس ۱۷ مارچ تک ملتوی کر دیا۔ عدالت نے یہ حکم متاثرہ بچے کے بھائی محمد عارف کی حبس بیجا کی درخواست پر دیا جسے بیلف نے عدالت میں پیش کیا تھا۔ بیلف نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ خالد محمود کو ۹ روز تک جیل میں رکھا گیا اور حکام نے اس سے سادہ کاغذ پر دستخط کرائے تھے۔ مزید یہ کہ کچھ دوسرے نابالغ افراد بھی جیل میں تھے۔ درخواست گزار نے اپنی شکایت میں بتایا کہ اس کے والد اور چچا نے "فینٹ" ٹریکٹر کے لئے زرعی ترقیاتی بنک گجرات سے ۱۷۶۲۲۵ قرض لئے جس کی سالانہ قسط ۳۱۷۵۲ روپے تھی۔ اس سلسلے میں مقروضوں کی زمین رہن تھی۔ ۱۹۹۲ء میں علاقے میں سیلاب کی وجہ سے ادائیگی نہ کی جا سکی۔ کسی پیشگی نوٹس کے بغیر نائب تحصیلدار چوہدری اقبال سہیل اور انسپکٹر اے ڈی بی پی گجرات ان کی غیر حاضری میں خالد محمود کو لے گئے اور اسے یہ جانتے بوجھتے محکمہ مال کے جیل میں بند کر دیا کہ وہ نہ تو اس قرض کا ضامن ہے نہ مقروض۔ درخواست گزار نے مزید بتایا کہ مدعا علیہان نے بچے کو گرفتار کرتے وقت کہا کہ اگر اسے چھڑانا ہے تو نمک مرچ کے لئے ان کے پاس آئیں۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۸ مارچ ۹۳

استاد کیسے کیسے !!!

ڈیرہ اسماعیل خان (نمائندہ خصوصی) مقامی پولیس ابھی تک گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ۱ کے استاد قاضی نعیم کو گرفتار نہیں کر سکی۔ واقعات کے مطابق اسکول کی نویں کلاس کے ایک طالب علم جاوید نے شکایت کی کہ بند مورچہ قاضی نعیم استاد اسے تنگ کرتا اور بلاوجہ اپنے گھر بلاتا ہے۔ جاوید کے والدین نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو آگاہ کیا جنہوں نے تحقیق کے بعد استاد قاضی نعیم کو قصوروار قرار دیتے ہوئے محکمۂ تعلیم سے تبادلے کی سفارش کی۔ ڈویژنل ڈائریکٹر تعلیم کی اسکول آمد پر جاوید کے والدین کو ان سے ملنے نہ دیا گیا جس پر جاوید کے والدین اور رشتہ داروں اور محلّہ داروں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا اور انہوں نے اسکول پر ہلّہ بول دیا اور اس پر استاد قاضی نعیم نے بند مورچہ پستول سے فائر کر دیا جس کے نتیجہ میں دو استاد سرفراز اور محمد خالد زخمی ہو گئے۔ دو استاد محمد شکیل اور اظہر ڈنڈوں سے بھی زخمی ہوئے۔ چاروں کو سول ہسپتال ایمرجنسی پہنچا دیا گیا۔ فائرنگ اور جھگڑے کے دوران مذکورہ استاد فرار ہو گیا۔ سٹی پولیس نے مقدمہ درج کر لیا ہے۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۷ مارچ ۹۳ء

بچّوں کو گھر میں بند کر کے سیر سپاٹا

واشنگٹن (انٹرنیشنل ڈیسک) امریکہ کے شہر لیک ووڈ میں ایک بے رحم اور سنگدل ماں اپنے گیارہ سالہ بیٹے اور ۱۲ سالہ بیٹی کو گھر میں بند کر کے ایک ہفتے کے لئے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ میکسیکو چلی گئی۔ جانے سے قبل ۳۶ سالہ وکٹوریہ ولسن چند ہدایات لکھ کر دے گئی اور ایک ہفتے کی خوراک بھی دے گئی لیکن ایک ہفتہ گزرنے کے بعد جب واپس آئی تو پولیس نے بچّوں کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۹ مارچ ۹۳

جیومیٹری بکس گم کرنے کی سزا

لاہور (کرائمز رپورٹر) ناصر پارک بلال گنج میں ایک ظالم باپ نے اپنے گیارہ سالہ کمسن روزے دار بیٹے محمد یونس کو اسکول میں جیومیٹری بکس گم کرنے پر ڈنڈوں جوتوں اور گھونسوں سے وحشیانہ تشدّد کیا اور یہ کہہ کر ہسپتال میں داخل کرایا کہ اس کا بیٹا چھت سے گرا ہے۔ زخمی محمد یونس نے جس کی سر کی ہڈی ٹوٹنے اور اندرونی چوٹوں کے باعث منہ اور جسم کے نازک اعضا سے خون آرہا تھا.... ڈاکٹروں اور صحافیوں کے سامنے ظالم باپ کا پول کھول دیا۔ تاہم پولیس کیس بننے کے بعد ملزم شیر محمد نے اپنے بیٹے کی تشویش ناک حالت دیکھ کر پروا کئے بغیر اسے ہسپتال سے غائب کر دیا۔ ہسپتال کے عملہ نے بچّے کے غائب ہونے کی تمام تر ذمہ داری متعلقہ پولیس پر ٹھہرائی ہے۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۹ مارچ ۹۳ء

عورت نے تاوان کے لئے بچی اغوا کرلی

کراچی (بیورو رپورٹ) صوبۂ سندھ میں پہلی بار ایک نامعلوم عورت نے مبینہ طور پر مقامی تاجر کی ۵ سالہ بیٹی کو تاوان کے لئے اغوا کر لیا۔ سولجر بازار پولیس نے اس واقعہ کی رپورٹ تاجر ذکریا کی طرف سے درج کر کے بچی اور ملزمہ کی تلاش شروع کر دی ہے۔ پولیس کے مطابق سولجر بازار کے علاقہ میں ایک اسکول میں کل ایک نامعلوم عورت اپنے بچے کو داخل کرانے کے لئے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آئی اور اسکول کے دفتر سے فرضی طور پر معلومات حاصل کرنے کے بعد جاتے ہوئے پانچ سالہ مریم کو اٹھاکر لے گئی۔ کچھ دیر بعد تاجر ذکریا کے گھر فون آیا جس کے ذریعے سے عورت نے انہیں بچی کی واپسی کے لئے ۳ لاکھ روپے کا انتظام کرنے کا کہا۔ پولیس نے تاجر ذکریا کی مدعیت میں بچی مریم کے اغوا برائے تاوان کا مقدمہ درج کر لیا ہے۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۲ مارچ ۹۳ء

بیگار کیمپ سے نوجوان کا فرار

ڈنگہ (نامہ نگار) نواحی گاؤں ڈھنڈالہ میں ایک جوان محمد رزاق ۲۲ سال بعد بیگار کیمپ سے بھاگ کر اپنے گھر آگیا۔ تفصیلات کے مطابق محمد رزاق ۱۹۷۰ء میں ۸ سال کی عمر میں بابا کانواں والی کے میلہ پر جاتے ہوئے گجرات کے قریب خر کاروں کے ہتھے چڑھ گیا تھا جو اسے بیہوش کر کے سوات سے آگے علاقہ غیر کے جنگل میں لے گئے نوجوان نے بتایا کہ وہ چند روز قبل پاک فوج کے کچھ جوانوں کی مدد سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ رزاق نے بتایا کہ "اس کیمپ میں کئی لڑکے لڑکیاں موجود ہیں۔ خر کار تمام قیدیوں کے جسموں کو داغتے ہیں اور بیڑیاں پہنا کر رکھتے ہیں۔ اس نے کیمپ کے مبینہ سردار کا نام اکبر خان بتایا جبکہ دیگر خر کاروں کا نام گل زمان، نور زمان، گل محمد، علی محمد پٹھان بتائے۔ رزاق نے جسم پر بیڑیوں اور داغوں کے نشان بھی دکھائے۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۲ دسمبر ۹۲ء

ٹیکسی کی ٹکر سے روزہ دار بچہ ہلاک

کراچی (فارن ڈیسک) ابوظہبی میں دوسری جماعت کے ۸ سالہ پاکستانی طالب علم کو ایک ٹیکسی نے ٹکر مار کر ہلاک کر دیا۔ گلف نیوز کے مطابق متوفی طالب علم محمد بلال فاروق نے اس المناک واقعہ کے روز اپنی زندگی کا پہلا روزہ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ سارے دن گھر پر رہا مگر روزے سے کچھ دیر قبل وہ شیخ خلیفہ بن زائد پاکستانی اسکول میں اپنے دوستوں سے ملنے گیا۔ تقریباً شام ۶ بجے گھر واپس آتے ہوئے اولڈ ائیرپورٹ روڈ پر ٹیکسی نے اسے ٹکر مار دی جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔

روزنامہ جنگ کراچی یکم مارچ ۹۳

اسکول کی فیس کے لئے اغوا برائے تاوان

بیجنگ (پ پ ا) چین کے دارالحکومت میں ایک طالب علم نے ایک بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تفصیلات کے مطابق ایک ۱۶ سالہ لڑکے "یانگ ویانگ" کو اپنے اسکول کی فیس ادا کرنی تھی مگر اس مقصد کے لئے اس کے پاس رقم نہ تھی۔ اس نے اپنے والدین سے فیس کی ادائیگی کے لئے پیسے مانگے انہوں نے انکار کر دیا جس سے بچہ دل برداشتہ ہو گیا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر اس کے ذہن نے ایک شیطانی منصوبہ بنایا اور اس نے اپنے پڑوسیوں کے ۶ سالہ بچے "یانگ سانگ ہی" کو ورغلایا اور اسے بہلا پھسلا کر ایک ویران مقام پر لے گیا جہاں پر اس نے بچے کو قتل کر کے دفنا دیا اور اس کے گھر والوں کو ایک گمنام خط بھیجا جس میں ان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ مطلوبہ رقم ۸ یو آن فلاں جگہ پر پہنچا دیں۔ یہ واقعہ چین کے ایک قانونی روزنامہ میں شائع ہوا ہے۔ جس میں مزید بتایا گیا ہے کہ چین میں اسکولوں کی تعلیم مفت تصور کی جاتی ہے مگر اسکولوں کے حکام کا مؤقف یہ ہے کہ فیسیں لینا ناگزیر ہے کیونکہ ان کے بغیر عملے کی تنخواہوں کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۲ مارچ ۹۳ء

بجلی سے محروم اسکول

ماتلی (نامہ گار) اسکول انتظامیہ اور علاقہ کے معززین نے کہا ہے کہ گڑیو گھنور ہائی اسکول گزشتہ کئی سالوں سے بجلی کی سہولت سے محروم ہے کیونکہ ایجوکیشن ورکس ڈپارٹمنٹ کی جانب سے اسکول کی عمارت تو تعمیر کرا دی گئی تھی مگر بجلی کی سہولت مہیا نہیں کی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ علاقے کے معززین اسکول انتظامیہ اور معصوم طالب علم سیکڑوں مرتبہ وفود کی شکل میں محکمہ واپڈا ماتلی کے چکر کاٹ کر تھک گئے ہیں مگر اسکول کو بجلی کی فراہمی کے سلسلے میں مسلسل ٹال مٹول کی جا رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ علاقہ کے معززین کی اپیل پر یونین ٹیکساس پاکستان نے ٹرانسفارمر اور بجلی کے جملہ اخراجات کے ڈیمانڈ نوٹس کے ساٹھ ہزار روپے فراہم کئے جو محکمہ واپڈا کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیئے گئے ہیں مگر افسوس کئی سال گزر جانے کے باوجود نہ ہی ٹرانسفارمر نصب کیا گیا اور نہ ہی بجلی کی فراہمی کے سلسلے میں کسی قسم کی پیش رفت ہوئی ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی ۲۳ فروری ۹۳ء

۵ سو بچے لاپتہ

سراجیوو (مانیٹرنگ ڈیسک) بوسنیا ہرزیگو وینا کے نائب صدر نے کہا ہے کہ "کریسکا" سے نکلنے والے پانچ سو افراد کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں، جن میں زیادہ تر بچے اور خواتین ہیں۔ انہیں سربیائی توپ خانے نے ٹھکانے لگا دیا ہے یا موت ان کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ بی بی سی کے مطابق یہ لوگ برف پوش پہاڑی ڈھلوانوں میں کہیں لاپتہ ہو گئے ہیں۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۹ مارچ ۹۳ء

مُستقبل کا مُستقبل

محمد عادل منہاج

حکومت ایک بہتر نظامِ تعلیم کے ذریعے بچے کی صلاحیت اور شخصیت کو نکھارنے کی کوشش کرے گی!

جب کافی کوشش کے بعد بھی فرحان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے کتاب بستے میں رکھ دی اور سوچ لیا کہ کل وہ اسکول میں اپنے سائنس ٹیچر سے اس تجربے کے بارے میں پوچھے گا جو اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ اسے سائنس کا مضمون بہت پسند تھا اور نت نئے تجربوں کا بھی اسے شوق تھا۔ کل ہی اس نے بک اسٹال پر "سائنسی تجربے" نامی کتاب دیکھی اور فوراً خرید لی۔ مگر کتاب میں بیان کیا گیا پہلا تجربہ اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ ویسے بھی ابھی وہ صرف نویں جماعت ہی میں تو تھا۔

اگلے دن اسکول میں ہاف ٹائم ہوا تو فرحان سیدھا اسٹاف روم جا پہنچا اور اپنے سائنس ٹیچر شاہد صاحب سے بولا "سر! مجھے یہ تجربہ سمجھا دیں۔"

"ہیں......! یہ کیا ہے بھئی؟" وہ چونک کر بولے۔ "سر، یہ سائنسی تجربوں کی کتاب ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہی آپ ذرا سمجھا

دیں۔" وہ بولا۔

"میاں...... ہمارے پاس کورس پورا کروانے کا ٹائم تو ہے نہیں اور تم یہ پوچھنے کے لئے کیا اٹھا لائے ہو۔ دفع کرو ان فضولیات کو اور جاکر اپنا کورس پڑھو۔ مجھے ابھی کاپیاں بھی چیک کرنی ہیں۔"

وہ جھلا کر بولے اور فرحان افسردہ ہو کر باہر چلا گیا۔ "یار بتا دیتے اسے۔ صاحب زادے کو پڑھنے کا شوق ہے۔" اردو کے ٹیچر بیگ صاحب بولے "تو میں کیا کروں بھائی۔ میں خود تنگ آیا ہوا ہوں۔ کیا رکھا ہے پڑھنے پڑھانے میں، تنخواہ میں آدھا مہینہ بھی نہیں کٹتا۔ ہر وقت پریشانی رہتی ہے۔ ایسے میں کون ڈھنگ سے پڑھائے۔" یہ تو ٹھیک ہے ایک تو کورس پورا کروانا ہے۔ اوپر سے بورڈ والوں نے کاپیاں چیک کرنے کو بھیج دی ہیں اب بتاؤ بھلا دو تین سو روپے کے لئے کون کاپیوں پر دماغ کھپائے۔ ایک کاپی پڑھنے میں ہی پندرہ بیس منٹ لگتے ہیں۔" شرافت صاحب نے کہا۔ "تو پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک آدھ نظر ڈال کر نمبر دے دیا کرو۔ میں تو آدھے گھنٹے میں ساری کاپیاں چیک کر دیتا ہوں۔" شاہد صاحب نے برا سا منہ بنایا۔

اسی وقت گھنٹی بج اٹھی۔

"اچھا بھائی میں چلتا ہوں۔ نویں کلاس کو پریکٹیکل کرانا ہے۔" شرافت صاحب بولے اور اٹھ کر کیمسٹری کی لیب کی طرف چل دیئے۔ سارے طالب علم آ چکے تھے "سامان نکالو بھئی۔" شرافت صاحب بولے اور چابیاں ملازم کو دیں۔ جس نے لیب میں رکھی بڑی سی پرانی الماری کا تالا کھولا اور سامان نکال کر میز پر رکھا۔ جسے سب بچے حیرت اور شوق سے دیکھ رہے تھے کیونکہ آج پہلی بار کیمسٹری کا پریکٹیکل ہو رہا تھا۔ "میز کے چاروں طرف کھڑے ہو جاؤ تاکہ سب کی سمجھ میں آجائے۔" شرافت صاحب بولے اور پریکٹیکل کر کے دکھانے لگے۔ چھوٹی سی میز کے گرد ستر اسی بچے کھڑے تھے۔ پیچھے والوں کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"سمجھ میں آگیا۔ اب جاؤ کل جنرل لکھ کر لے آنا۔" شرافت صاحب بولے۔ "سر...... کیا ہم خود پریکٹیکل نہیں کریں گے؟" فرحان نے پوچھا۔

"آلات کا صرف ایک سیٹ ہے اور اسی طالب علم۔ کون کون پریکٹیکل کرے گا اور پھر اتنا قیمتی سامان ہے اگر ٹوٹ گیا تو پھر ملنے کی امید بھی نہیں۔ کیا سمجھے؟"۔

فرحان حیرت سے ان قیمتی آلات کو دیکھنے لگا جسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ارشمیدس اور فیثا غورث نے ابتدائی تجربات اسی سامان سے کئے ہوں گے۔ شرافت صاحب نے سارے آلات اور ساز و سامان کو دوبارہ الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔

"امتحان میں پندرہ دن رہ گئے ہیں۔ شاہد

صاحب آپ کا کورس پورا ہو گیا؟" بیگ صاحب نے پوچھا۔ "کہاں سے پورا ہو گا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کورس بناتا کون ہے۔ سوچے سمجھے بغیر ہر چیز ٹھونس دی جاتی ہے' دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم ابھی تک وہی گھسا پٹا کورس پڑھا رہے ہیں" شاہد صاحب بولے۔ "واقعی ہمارے ملک میں تعلیم کا معیار یہی ہے۔ جتنی موٹی کتاب ہو گی تعلیم کا معیار اتنا ہی بلند ہو گا"۔ بیگ صاحب نے لقمہ دیا۔

"میں تو آج خاص خاص سوالوں پر نشان لگوا دوں گا۔ تاکہ سر سے بلا اُترے"۔ شاہد صاحب کے لہجے میں بیزاری تھی۔

امتحان شروع ہو چکے تھے۔ فرحان کے پرچے ٹھیک ٹھاک ہی ہو رہے تھے مگر اسے پڑھنے میں مزہ نہیں آرہا تھا۔ اس کی ساری دلچسپی اس بور طریقۂ تعلیم سے اچاٹ ہو گئی تھی۔ اب وہ بھی خاص خاص سوالات رٹتا اور مزے کی بات کہ وہ سوالات امتحان میں پوچھے جاتے۔ امتحانی پرچے بنائے اس طرح جاتے تھے کہ ایک سال جو سوال آتا تھا اسے لازماً ایک سال بعد دوبارہ آنا تھا۔ یوں چار پانچ سال پرانے پرچے دیکھ کر اگلے سال کے پرچے کے لئے اچھا خاصا آئیڈیا ہو جاتا تھا کہ کیا کچھ پوچھا جا سکتا ہے۔

امتحان ختم ہوئے۔ پریکٹیکل باقی رہ گئے مگر ان کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا وہ اسکول والوں نے خود لینے تھے اور چونکہ ہر سامان کا صرف ایک ہی سیٹ تھا اس لئے طالب علموں سے پریکٹیکل کروانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بس پریکٹیکل والے دن انہیں بلوایا گیا اور کہا گیا کہ جو پریکٹیکل کرنا ہے بس اس کا طریقہ کاپی پر لکھ دو باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

آج اسکول میں خوب رونق تھی۔ نتیجہ سنایا جانے والا تھا۔ اسکول کو خوب سجایا گیا تھا کیونکہ محکمۂ تعلیم کے سیکرٹری صاحب آنے والے تھے۔ خوش قسمتی سے ہیڈ ماسٹر کے چچا جان کی سیکرٹری تعلیم سے جان پہچان تھی۔ چنانچہ ان کی سفارش پر سیکرٹری صاحب نے اسکول کی سالانہ تقریب میں مہمان خصوصی بننا قبول کر لیا تھا۔ جلسہ شروع ہوا۔ تلاوت وغیرہ کے بعد نتائج کا اعلان ہوا۔ نویں کلاس میں فرحان احمد فرسٹ آئے ہیں۔ فرحان احمد"۔

جب اس کا نام پکارا گیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ تالیوں کی گونج میں اس نے سیکرٹری صاحب سے اپنا انعام لیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر رپورٹ کارڈ پر نظر ڈالی تو اسے بہت حیرت ہوئی۔ جو پرچے اچھے ہوئے تھے۔ ان میں کم نمبر تھے اور جو پرچے نسبتاً خراب ہوئے تھے۔ ان میں بہت اچھے نمبر تھے۔ وہ حیرت سے رپورٹ کارڈ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نمبر کس حساب سے دیئے گئے ہیں۔

"تعلیم پر بچّے کا بنیادی حق ہے اور مجھے خوشی ہے کہ یہ اسکول اس حق کو خوب ادا کر رہا ہے۔ مجھے یہاں کے اساتذہ نے بے حد متاثر کیا ہے

جنہوں نے محنت اور لگن سے اپنا فرض ادا کیا جس کی وجہ سے یہاں کا رزلٹ ۹۰ فیصد آیا ہے"۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ تقریر جاری تھی۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ اسکول کی لیبارٹری کے حالت اچھی نہیں اور سامان کی بھی کمی ہے لہٰذا میں لیبارٹری کی حالت بہتر بنانے کے لئے دس ہزار کا عطیہ پیش کرتا ہوں۔" اس اعلان سے اساتذہ کو تو خوشی ہوئی ہی مگر فرحان بھی بے حد خوش تھا کہ چلو اب لیبارٹری کے لئے نیا سامان تو آئے گا اور طالب علموں کو خود بھی پریکٹیکل کرنے کا موقع ملے گا۔

چھٹیوں کے بعد اسکول کھلا تو پہلے ہی روز سارے طالب علم فزکس کا پریکٹیکل کرنے لیب میں پہنچے۔ آج فزکس کا پہلا پریکٹیکل تھا۔

سامان نکال کر میز پر رکھ دیا گیا۔

"سب لوگ پھیل کر کھڑے ہو جائیں" شاہد صاحب نے حسبِ معمول ہدایت کی۔ طالب علم میز کے چاروں طرف پھیل کر کھڑے ہو گئے۔ شاہد صاحب انھیں پریکٹیکل کر کے دکھا رہے تھے اور فرحان حیرت سے صدیوں پرانے، رنگ آلود ان آلات کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ لیبارٹری کا سامان خریدنے کے لئے جو دس ہزار روپے ملے تھے وہ کہاں چلے گئے؟

بچے اور بیگار

واشنگٹن (این این آئی) پاکستان میں بڑی تعداد میں لوگوں سے جبری مشقت لی جارہی ہے جن میں ۷۵ لاکھ معصوم بچے بھی شامل ہیں۔ یہ بات بین الاقوامی مزدور تنظیم آئی ایل او کے ایک حالیہ سروے میں بتائی گئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ بیس لاکھ افراد پر مشتمل غلام خاندان اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرتے ہیں۔ جبری مشقت عام طور پر مچھلیوں کی پیکنگ، جوتے بنانے پتھر کوٹنے اور سگریٹ تیار کرنے کے یونٹوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ زراعت کے شعبے میں بھی اکثر لوگوں سے بیگار لی جاتی ہے اور انہیں "گہنا مخلوق" یا "رہن پر رکھے گئے لوگ" کہا جاتا ہے۔

اس غلام طبقے کو انتہائی کم معاوضے پر تعمیراتی ڈیم اور آبپاشی کے منصوبوں میں کام پر لگایا جاتا ہے۔ تقریباً پانچ لاکھ افغان مزدور جن میں بچے بھی شامل ہیں، حال ہی میں بیگار کے کاموں میں شامل کئے گئے ہیں۔ پاکستان کے آئین اور ۱۹۹۲ء میں جاری ہونے والے ایک قانون کے تحت جبری مشقت کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ تاہم یہ سلسلہ روز بروز گھمبیر ہوتا چلا جارہا ہے۔ سروے کے مطابق بھارت میں ڈیڑھ کروڑ افراد سے بیگار لی جاتی ہے جن میں بچوں کی تعداد پچاس لاکھ ہے جبکہ بھارتی حکومت کا تخمینہ صرف تین لاکھ ترپن ہزار ہے۔ صرف کھیتی باڑی کے شعبے میں بھارت میں بیس لاکھ افراد سے جبری مشقت لی جارہی ہے۔ جبکہ پتھر کوٹنے، قالین بافی اور گھریلو ملازمت میں بیگار لینے کا رجحان مسلسل بڑھ رہا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے علاوہ تھائی لینڈ، سوڈان، ہیٹی، پیرو، برازیل اور ڈومینکن ریاست بھی اس سنجیدہ مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔

زولوجیکل گارڈن میں

بچے کی زندگی کی حفاظت اور اس کی پرورش اچھے طریقے سے کی جائے گی۔

طاہر مسعود

کل میں فرصت نکال کر مسٹر اینڈ مسز سلیمان بجلی والا سے ملنے بنگلے پر گیا۔ دونوں میاں بیوی گھر میں موجود تھے۔ نہایت خوشدلی سے استقبال کیا۔ ان کے پرتپاک رویے سے لگ رہا تھا کہ انھوں نے میری اچانک آمد کا اپنے دل میں بُرا نہیں منایا ہے۔ ہم ڈرائنگ روم میں موسم کے موضوع پر خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ دریچے کے راستے دو خرگوش اُچھل کر اندر آگئے۔ میں نے انھیں اخلاقاً اپنے سے قریب بلا کر پیار سے پشت پر ہاتھ پھیرنا چاہا تاکہ مسٹر اینڈ مسز بجلی والا کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور وہ خوش ہو جائیں لیکن بدبخت خرگوشوں نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور بھاگ گئے۔ "بہت شرمیلے ہیں!"۔ مسز سلیمان نے پیار سے کہا۔ "نہایت نادر قسم کے خرگوش لگتے ہیں۔" میں نے خیال آرائی کی۔ "شکریہ شکریہ!" میاں بیوی واقعی خوش ہو گئے۔ انھیں

جانوروں سے بے پناہ لگاؤ تھا۔

اس گھرانے سے میری ملاقات عرصہ قبل زولو جیکل گارڈن میں ہوئی تھی۔ جہاں میں ایک خوبصورت ہرن کو جنگلے سے ہاتھ بڑھا کر چیونگم کی آفر کر رہا تھا۔ یک لخت پیچھے سے ہنسی کی آواز آئی۔ "حیرت ہے آپ کو آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ہرن کو چیونگم سے پرہیز ہے"! یہ مسٹر سلیمان بجلی والا تھے، جن کے فقرے اور جن کی البیلہ کی ہنسی سے ہمارے تعارف کا آغاز ہوا۔ گو میں اس مسئلے پر ان سے خاصی دیر تک اُلجھا رہا کہ جانور چیونگم کیوں نہیں چباتے؟ انھوں نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ چڑیا گھر کے جانوروں کو بوریت سے بچنے کے لئے چیونگم کی عادت ڈال لینی چاہئے۔ علیحدہ ہوتے وقت بجلی والا صاحب نے خلوص سے اپنا کارڈ عنایت کرتے ہوئے گھر مدعو کیا۔ اس وقت ہم ایک لکڑ بگھے کے قریب الوداعی گفتگو میں مصروف تھے۔ لکڑ بگھا بار بار اپنا سر جنگلے سے رگڑتا تھا جیسے بجلی والا صاحب کے گھر جانے کے لئے اصرار کر رہا ہو۔

سو اس واقعے کو کافی دن ہو گئے تھے اور اب میں فرصت نکال کر ان کے گھر پہنچا تھا۔ خرگوش کے کمرے سے جانے کے بعد ہم ان کے اوریجن پر دیر تک بات چیت کرتے رہے۔

مسز سلیمان کہنے لگیں۔ "گئے برس ہمارا ارادہ مگرمچھ خریدنے کا تھا، لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ مگرمچھ کتنے مہنگے ہو چکے ہیں"۔

"بات یہ ہے مسز سلیمان!" میں نے کہا۔ "مگرمچھ خریدنا عیاشی ہے۔ شہر میں پانی کی شدید قلّت ہے اور ایسے میں اگر ہمیں کوئی مگرمچھ مُفت بھی دینا چاہے تو معذرت کر لینی چاہئے"۔

"آپ کے خیال میں مگرمچھ کا متبادل کیا ہو سکتا ہے"۔ انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"دیکھئے مگرمچھ کا متبادل صرف مگرمچھ ہی ہو سکتا ہے۔ البتہ آپ مجھ سے مشورہ لینا چاہیں تو میں زرّافہ خریدنے کی سفارش کروں گا"۔ میں نے کہا۔

"زرّافے میں بھلا کیا خوبی ہے"؟ مسز سلیمان کے میاں بولے۔

"اس کی گردن بے انتہا لمبی ہوتی ہے، آپ کا گھر ڈھونڈنے میں لوگوں کو دشواری پیش نہیں آئے گی"۔

"ہاں یہ تو ہے! لیکن ہمارے ہاں لوگ ہی کتنے آتے ہیں!" وہ افسردگی سے بولیں۔

"زرّافہ آجائے پھر لوگ بھی آنے لگیں گے"۔

"گڈ آئیڈیا!" مسٹر سلیمان اچھل پڑے۔ پھر دونوں نے مل کر طے کیا کہ نئے سال کے بجٹ میں وہ ایک زرّافے کے اخراجات کی بھی گنجائش نکالیں گے۔ یک بیک جیسے مسز سلیمان کو کچھ یاد آگیا ہو، وہ اپنے میاں کو مخاطب کر کے بولیں۔

"تم نے دیکھا! اس نے کیا حال بنا رکھا

ہے"؟

"بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ مجھ سے خود اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ رات بھر جاگتا، ٹہلتا اور چائے پیتا رہتا ہے۔ بھئی اس دور سے ہم بھی گزرے ہیں لیکن......"

"کل رات اچانک میری آنکھ کھل گئی، ایسا لگا جیسے کوئی روح ٹہل ٹہل کر بڑبڑا رہی ہو"۔ مسز سلیمان بولیں۔

"اگر وہ شروع سال سے توجہ دیتا تو اتنی محنت کی ضرورت ہی کیا تھی؟!" اس موقع پر میں نے مسٹر سلیمان کو ٹوکا اور مداخلت کی۔

"سلیمان صاحب! میں آپ کی گفتگو کی تہہ تک اُترنے سے قاصر ہوں لیکن اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو شاید آپ یہ گفتگو اپنے پالتو اود بلاؤ کے متعلق کر رہے ہیں"۔

یہ سنتے ہی مسز سلیمان تلخی سے بولیں۔ "مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کا اندازہ عبرتناک حد تک غلط نکلا"۔ میں سکتے میں آگیا۔ چند لمحے بعد مسز سلیمان کے میاں نے انکشاف کیا کہ وہ یہ ذکر اپنے اکلوتے بیٹے پپّو کے متعلق کر رہے ہیں جو ان دنوں میٹرک کا امتحان دے رہا ہے۔

میں نے درخواست کی کہ وہ اسے بُلائیں تاکہ میں اسے چند نصیحتیں اور امتحان میں اچھے نمبر لانے کے آزمودہ گُر بتلا دوں۔ چند لمحے میں ایک چڑھی چڑھی آنکھوں والا لڑکا جو کچھ ناراض اور غصّے میں لگ رہا تھا۔ سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مسز سلیمان نے شفقت سے اس کی پشت پر اسی طرح ہاتھ پھیرتے ہوئے جس طرح انھوں نے گارڈن میں ہرن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تھا، کہا۔ "پپّو! یہ تمہارے انکل ہیں۔ یہ امتحان پاس کرنے میں تمہاری مدد کریں گے"۔

"ہیں"۔ پپّو کی بتّیسی...... باہر آگئی۔ "کیا آپ کی بورڈ آفس میں میں جان پہچان ہے؟"

"پپّو بیٹے! آپ اپنی محنت سے کامیابی حاصل کریں گے۔ میں تو آپ کو صرف چند ترکیبیں بتاؤں گا۔ میں نے خوشدلی سے کہا۔

"جلد بتائیں! میرا کل انگریزی کا پرچہ ہے، مجھے ابھی کئی سوالات یاد کرنے ہیں"۔ وہ بیزاری بلکہ بدتمیزی سے بولا۔ تبھی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا شاندار نمبروں سے فیل ہو جائے گا۔ اس بات کو مسز سلیمان بجلی والا نے بھی محسوس کیا اور انھوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "پپّو! آرام! آرام سے بات کرو۔"

پھر میں نے اسے امتحان میں پاس ہونے کی چند ترکیبیں بتائیں، جسے سن کر وہ خوشی سے اُچھلنے لگا پھر اپنی ماں سے بولا۔

"ممّی! آپ انھیں تحفے میں خرگوش دے دیجئے نا!"

مسز سلیمان چپ رہیں، انہیں اپنے بچّے کی تجویز سے اتفاق نہ تھا۔

"کیا آپ ہمارے خرگوش میں دلچسپی لے رہے ہیں؟" مسٹر سلیمان نے گیند میرے کورٹ میں پھینک دی۔

"جی نہیں، شکریہ! میں خرگوش کو پسند نہیں کرتا"۔ میں نے معذرت کے ساتھ گیند واپس کر دی۔ مسز بجلی والا نے شفقت سے مجھے دیکھا، اتنی شفقت سے انھوں نے کبھی اپنے بچّے کو بھی نہ دیکھا ہو گا اور اگر دیکھا ہوتا تو اس کی کم از کم یہ حالت نہ ہوتی۔ دفعتاً میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"سلیمان صاحب! آپ کا طوطا کہیں دکھائی نہیں دے رہا"!

"یہ سامنے جو کھڑا ہے"۔ انہوں نے پپّو کی طرف اشارہ کیا۔

مسز سلیمان جھٹ بولیں۔ "یہ آپ کے بیٹے کے بارے میں نہیں، طوطے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں"۔

"چلو ایک ہی بات ہے" مسٹر سلیمان بوریت سے بولے۔

"ممّی اور ڈیڈی تو سارا وقت طوطا، مینا، اُودبلاؤ اور لکڑ بگھے میں لگے رہتے ہیں۔ مجھے تو وقت ہی نہیں دیتے"۔ پپّو نے رو کر گلہ کیا۔

"اومائی ڈارلنگ!" مسز سلیمان بجلی والا کی ممتا نے جوش مارا اور انہوں نے کھینچ کر پپّو کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ تب پپّو کی آنکھوں میں سکون اور طمانیت کا احساس جاگا۔ یہ احساس میں نے مسز بجلی والا کی گود میں دُبکے ہوئے خرگوش کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ کافی وقت گفتگو میں بہہ چکا تو میں نے اجازت چاہی۔ واپسی پر مجھے لگا کہ زولوجیکل گارڈن سے لوٹ کر آیا ہوں جہاں سارے جانور مگن ہیں، سوائے ایک انسان کے بچے کے۔

تعلیم کے میدان

میں کون کہاں؟

دو سال قبل بچوں کے لئے ہونے والی عالمی سربراہ کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے دس برسوں میں دنیا بھر کے ۸۰ فیصد بچوں کے لئے پرائمری تعلیم کا حصول ممکن بنایا جائے گا۔ اس وقت صرف مشرقی ایشیا کے ممالک ایسے ہیں جن میں بچوں کی پرائمری تعلیم کا تناسب ۸۰ فیصد سے زائد ہے۔ عرب ریاستوں میں یہ تناسب ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ۶۷ فیصد تھا جو ۱۹۸۸ء میں بڑھ کر ۷۲ فیصد ہو گیا ہے۔ افریقی ممالک میں ۸۰ء میں تناسب ۶۰ فیصد تھا جو ۸۸ء تک کم ہو کر ۵۵ فیصد رہ گیا۔ لاطینی امریکہ کے ممالک میں یہ تناسب ان ہی برسوں میں ۵۵ فیصد تھا جو بڑھ کر ۶۴ فیصد ہوا ہے۔ جنوبی ایشیا میں یہ تناسب ۵۱ فیصد تھا جو بڑھ کر ۵۹ فیصد ہوا ہے جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں پرائمری تعلیم کا تناسب ۳۵ فیصد تھا جس میں ۱۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔

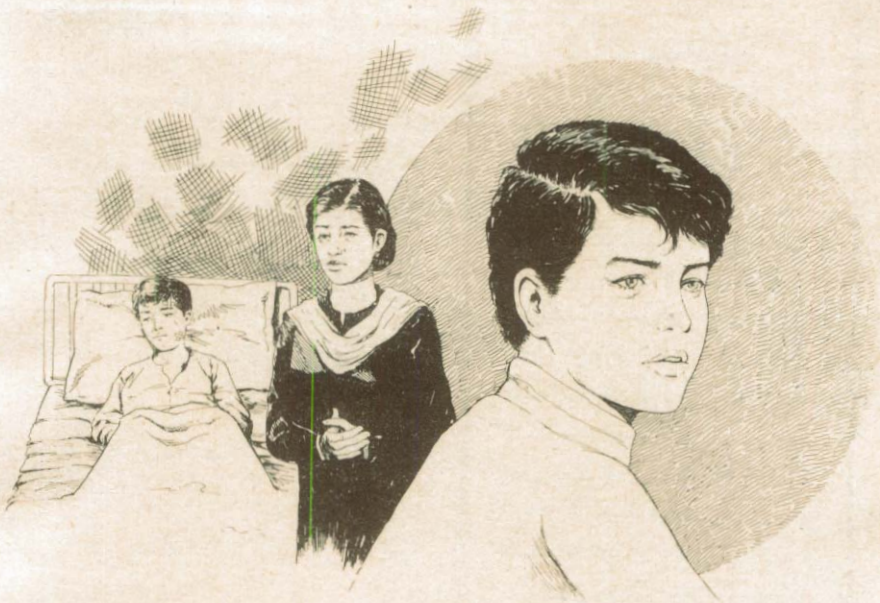

چوٹ

محمد عمر احمد خان

معذور بچوں کی دیکھ بھال اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی جائے گی۔

جب وہ پیدا ہوا تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ صحت مند اور نارمل بچّہ۔ اسے دیکھ کر سب بے حد خوش تھے لیکن بیگم رحمٰن اور ان کے شوہر جو مقامی بینک میں منیجر تھے، انہیں کہیں زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ انہوں نے بچّے کا نام "ارمان" رکھا تھا کیوں کہ وہ بڑے ارمانوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ ان کا چوتھا بچّہ تھا جبکہ دونوں میاں بیوی کو بیٹے کی خواہش تھی کیوں کہ ان کے تین بچّوں میں تینوں ہی بیٹیاں تھیں اور اب بیٹا پیدا ہوا تھا تو جیسے پورے گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

چھوٹی بچّیاں بھی اپنے پیارے سے گول مٹول صحت مند بھائی کو پا کر خوشی سے نہال ہو رہی

تھیں۔ کبھی وہ اپنے مُنّے بھائی کے گالوں کو پیار کرتیں، کبھی اس کا ماتھا چُومتیں تو کبھی اس کی ننھی ننھی انگلیاں پکڑ کر ہلاتیں۔ اس سے پیاری پیاری باتیں کرتیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ابھی بہت چھوٹا ہے بات نہیں کر سکتا۔ لیکن شاید یہ بات قدرت کو معلوم تھی کہ وہ پیارا بچّہ ایک نقص لے کر پیدا ہوا ہے۔

ڈھائی تین سال تک تو اس نقص کا پتہ ہی نہ چل سکا کہ اصل گڑبڑ کیا ہے؟ لیکن جب وہ کافی دنوں تک اوں آں کرتا رہا اور کچھ بول نہیں پایا تو بیگم رحمٰن اور ان کے شوہر کو اس گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ اسے بچّوں کے ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور قابل ڈاکٹر نے "ارمان" کا تفصیلی چیک اپ کرنے کے بعد بڑی مایوسی سے بتایا کہ بچّہ کبھی نہیں بول سکے گا کیوں کہ وہ گونگا ہے۔ یہ خبر بیگم رحمٰن اور ان کے شوہر کے لئے کسی صدمے سے کم نہ تھی۔ ڈاکٹر نے ارمان کے اور بھی مختلف ٹیسٹ لئے اور پھر تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "جو بچّے پیدائشی گونگے ہوتے ہیں وہ بہرے بھی ہوتے ہیں لیکن آپ کا بچّہ بہرہ نہیں۔ آپ کو اس بات کے لئے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے" اور اس بات پر بیگم رحمٰن اور ان کے شوہر نے اللہ کا شکر ادا کیا اور ارمان کی پرورش میں لگ گئے۔ وہ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتے اور اس پر پوری توجہ دینے کی کوشش کرتے۔ بہنیں بھی اپنے چھوٹے بھائی پر فدا رہتیں۔ بیگم رحمٰن بہنوں کو بھائی کے ساتھ محبت کے ساتھ پیش آتا دیکھتیں تو خوش ہوتیں لیکن ان کا دُکھ اس وقت بڑھ جاتا جب ملنے ملانے والے ان کے گھر آتے اور ارمان کو دیکھ کر کہتے "کتنا پیارا بچّہ ہے لیکن افسوس بے چارہ گونگا ہے!!"۔ "گونگے" کا لفظ سنتے ہی انہیں یوں لگتا جیسے کسی نے یہ کہہ کر ان کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔

بیگم رحمٰن کے شوہر بینک کے کام کے دباؤ کی وجہ سے ارمان پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتے لیکن بیگم رحمٰن اس کی دیکھ بھال پر پوری توجہ دینے کی کوشش کرتیں۔

ارمان جب چھ سال کا ہو گیا تو وہ اسے گونگے بہرے بچّوں کے اسکول میں داخل کرانے لے گئیں اور جب اسے اسکول میں داخلہ کرا کے واپس گھر آئیں تو اپنے کمرے میں جا کر بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ انہیں اسکول میں لگا بورڈ جس پر جلی حرفوں میں اسکول کے نام کے ساتھ "معذور بچّوں کا اسکول" برائے گونگے بہرے بچّے لکھا تھا، رہ رہ کر یاد آتا رہا۔

ارمان بول نہیں سکتا تھا لیکن سب کچھ سُن سکتا اور محسوس کر سکتا تھا۔ زبان نہ ہونے کے باوجود وہ اشاروں سے ماں کو اپنی ساری بات سمجھا دیا کرتا۔ بیگم رحمٰن بھی اس کی ہر بات سمجھتی تھیں لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے دل کی کوئی بات ماں کو سمجھا نہیں پاتا تو پھر ناراض ہو کر اپنا سر پکڑ لیتا کہ ماں آخر اس کی بات سمجھ کیوں نہیں رہی؟ ایسے مرحلے پر بیگم رحمٰن کا دل بھر آتا اور وہ سوچتیں

کاش اس کی زبان ہوتی تو وہ اپنے دل کی بات بتا سکتا۔

ارمان کی کوئی بات جب سمجھ میں نہیں آتی تو بیگم رحمٰن اسے گود میں اُٹھا لیتیں اور اس کو پیار کرنے لگتیں۔ وہ بھی خوش ہو کر اپنی بات بھول جاتا، ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر خوشی کا اظہار کرنے لگتا، اور زور زور سے آں آں کرنے لگتا۔

شروع شروع میں اسے اسکول کے ماحول سے ڈر لگا تھا لیکن جب بیگم رحمٰن ایک ہفتے مسلسل اس کے ساتھ خود اسکول جا کر اس کی کلاس میں کچھ دیر بیٹھتیں رہیں تو ارمان کا خوف کم ہو گیا۔ اب وہ خود بڑے شوق سے صبح اسکول جانے کے لئے تیار ہونے لگا تھا۔ بیگم رحمٰن اسے اپنے ہاتھوں سے تیار کرتیں۔ تینوں بچیوں کا بھی صبح کا اسکول تھا۔ وہ ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں اور ایک ساتھ جاتی تھیں جب کہ ان کے بھائی ارمان کا اسکول الگ تھا۔ اسکول کی طرف سے گاڑی اسے لینے آتی تھی۔ یہ گاڑی بیگم رحمٰن نے اسے لگوائی تھی۔ جب سے ارمان کی کلاس ٹیچر نے کہا تھا کہ معذور بچے بہت زیادہ توجہ اور دیکھ بھال کے حقدار ہوتے ہیں اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا ماں باپ کی ذمہ داری ہے تو وہ ارمان کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگی تھیں۔

وقت کا پہیہ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ بیگم رحمٰن اپنے بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ بچے اب کافی بڑے ہو گئے تھے۔ سائرہ فرسٹ ائر میں پہنچ گئی تھی۔ اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اس لئے اس نے میڈیکل کی تعلیم کا انتخاب کیا تھا۔ فاخرہ نویں میں تھی۔ وہ کامرس پڑھ رہی تھی۔ جبکہ آمنہ پانچویں جماعت کی طالبہ تھی۔

ارمان بارہ سال کا ہو گیا تھا وہ تیسری جماعت میں پڑھ رہا تھا اور پڑھائی میں بہنوں کی طرح تیز تھا۔ پرنسپل صاحب اور اسکول کے اساتذہ اس کی ذہانت اور قابلیت سے خاصے متاثر تھے۔ اس کا قد بھی کافی نکل آیا تھا۔ پیارا سا تو وہ بچپن ہی سے تھا۔ بڑا ہو کر اور اچھا لگنے لگا تھا۔ گھر میں وہ ماں سے زیادہ مانوس تھا۔ بہنیں پڑھائی میں لگی رہتیں اس لئے اس پر زیادہ توجہ نہ دے پاتیں۔ رہ گئی آمنہ تو اسے سونے کی خوب عادت تھی۔ اسکول سے آ کر وہ کھانا کھاتی اور سو جاتی۔ کھانا اور سونا ہی اس کا کام تھا۔

ارمان اسکول سے پڑھ کر گھر آتا تو اس کا دل چاہتا کہ بہنیں اس سے باتیں کریں۔ اس کی پڑھائی اور اسکول کے متعلق پوچھیں لیکن کھانے کی میز پر خاموشی چھائی رہتی۔ کھانا کھانے کے بعد بہنیں اپنے کمروں میں چلی جاتیں۔ آرام کرتیں یا پڑھتیں۔ گھر کے ماحول میں خاموشی پھیل جاتی اور ارمان کے اندر کی خاموشی مزید بڑھ جاتی وہ بھاگ کر ماں کے کمرے میں پہنچ جاتا اور ماں سے لپٹ کر اشاروں اشاروں میں اپنے اسکول کی باتیں ماں کو

سنانے لگتا۔ بیگم رحمٰن جب اس کی اشاروں کی باتوں سے تھک جاتیں تو کہتیں "اچھا! چلو اب اپنے کمرے میں جا کر آرام کرلو۔ میں بھی کچھ دیر لیٹوں گی۔"

ماں کی یہ بات سن کر بڑی تابعداری سے ارمان اپنے کمرے میں سونے چلا جاتا لیکن اسے دوپہر میں نیند نہیں آتی تھی۔ جب سب سو جاتے تو اسے غصّہ آنے لگتا کہ سب کیوں سو گئے ہیں؟ کوئی اس سے باتیں کیوں نہیں کر رہا؟

بیگم رحمٰن کچھ دنوں سے محسوس کر رہی تھیں کہ اس کے مزاج میں کچھ خاموشی پن آگیا ہے۔ ان سے بھی وہ اب گرم جوشی کے ساتھ اشاروں کی زبان میں باتیں نہیں کر پاتا۔

ایک سہ پہر ان کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ انہوں نے پورے گھر میں اسے تلاش کیا لیکن وہ موجود ہی نہ تھا۔ انہوں نے چوکیدار سے پوچھا تو اس نے بتایا "بیگم صاب! وہ سامنے میدان میں کرکٹ کھیل رہا ہے۔ روز کھیلنے جاتا ہے۔" "روز کھیلتا ہے؟" بیگم رحمٰن نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ پھر انہوں نے چوکیدار سے پوچھا "کس وقت کھیلنے جاتا ہے؟" "تین بجے کے بعد بیگم صاب!" چوکیدار نے بتایا۔ "اوہ میرے خدا!" بیگم رحمٰن نے سر پکڑ لیا۔ "اتنی گرمی میں وہ کرکٹ کھیلتا ہے۔" شام پانچ بجے سے پہلے ہی وہ واپس آگیا اور چُپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بیگم رحمٰن سیڑھیاں

کر اس کے کمرے میں پہنچیں تو وہ عمران خان اور جاوید میانداد کی بڑی بڑی رنگین تصویریں ٹیپ سے دیوار پر لگا رہا تھا۔ ماں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اسے کچھ حیرت سی ہوئی پھر وہ نہایت خوش دلی سے ماں کے قریب آیا اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں تصویریں دکھانے لگا اور اشاروں میں بتانے لگا کہ دونوں تصویریں وہ اپنے دوست کی دکان سے بیس روپے میں لایا ہے۔ پھر اس نے اشارے سے پوچھا کہ "تصویریں کیسی ہیں؟" بیگم رحمٰن نے کہا "تصویریں تو اچھی ہیں لیکن یہ تم روز دھوپ میں جا کر جو کرکٹ کھیلتے ہو یہ اچھی بات نہیں۔ کل سے دھوپ میں کرکٹ کھیلنے نہیں جاؤ گے۔" بیگم رحمٰن نے محسوس کیا کہ ان کی اس بات سے اس کا چہرہ کچھ بجھ سا گیا۔ جب وہ کسی بات پر ناراض یا اُداس ہوتا تھا تو بیگم رحمٰن جھک کر بڑے پیار سے اس کی پیشانی چوم لیتی تھیں لیکن اب وہ ساتویں میں آ چکا تھا اور کافی بڑا ہو گیا تھا۔ بیگم رحمٰن اب اس کو اس طرح پیار نہیں کرتی تھیں۔

دوسرے دن وہ کرکٹ کھیلنے نہیں گیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہا۔ بیگم رحمٰن نے اسے پڑھتے دیکھا تو مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں۔

بیگم رحمٰن تو اس پر اپنی سی توجہ دے رہی تھیں لیکن اب اس میں گرم جوشی والی کیفیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اسکول سے آتا۔ چُپ چاپ کھانا کھاتا پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ بیگم رحمٰن سمجھ

گئیں کہ وہ ان سے ناراض ہے کیوں کہ انہوں نے اسے دھوپ میں کرکٹ کھیلنے سے منع جو کیا تھا۔ ایک دن انہوں نے اس سے کہا کہ وہ سارا وقت گھر میں ہی رہتا ہے۔ شام میں کرکٹ کھیلنے چلا جایا کرے۔ کچھ دنوں تک تو وہ کرکٹ کھیلنے نہیں گیا لیکن پھر آہستہ آہستہ شام میں اپنا بلاّ سنبھال کر کرکٹ کھیلنے جانے لگا۔ اس کی باہر سے کبھی کوئی شکایت نہیں آتی تھی لیکن ایک دن شکایت بھی آگئی۔ گراؤنڈ میں اس نے بلاّ مار کر کسی بچّے کا سر پھاڑ دیا تھا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اس بچّے نے ارمان کو "گونگا" کہا تھا جس پر اس نے غصّے میں آکر بچّے کے سر پر بلاّ دے مارا۔ بیگم رحمٰن نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا اور وہ سر جھکا کر ماں کی باتیں سنتا رہا لیکن دوسرے دن پھر اس کی شکایت آگئی۔ اس نے ایک دوسرے بچّے کو مکّوں سے خوب پیٹا تھا۔ اس بچّے کی پٹائی بھی اس نے گونگا کہنے پر کی تھی۔

ارمان کی روز شکایتیں آنے لگی تھیں۔ بیگم رحمٰن اسے سمجھا سمجھا کر تھک جاتیں لیکن وہ ماں کی بات نہیں مان رہا تھا۔ جو کوئی بھی اسے گونگا کہہ دیتا تو وہ اس کی پٹائی لگا دیتا۔ روز بروز وہ چڑچڑا بھی ہوتا جا رہا تھا۔

ایک شام پانچ بجے جب بیگم رحمٰن سو کر اٹھیں تو آمنہ کے رونے اور چلاّنے کی آواز آ رہی تھی۔ بیگم رحمٰن گھبرا کر اُٹھیں اور انہوں نے اپنے کمرے سے باہر آکر دیکھا تو آمنہ ارمان سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "تم بدتمیز ہو۔ تم میرے بھائی نہیں اور ..... اور ..... تم "گونگے" بھی ہو۔" آمنہ کا یہ جملہ سن کر ارمان جو ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ پاگلوں کی طرح آگے بڑھا۔ اس نے آمنہ کو زور سے تھپّڑ مارا پھر اسے دھکّا دے کر صوفے پر پھینک دیا۔ آمنہ صوفے سے ٹکرائی اور اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ "ارمان! رک جاؤ۔" بیگم رحمٰن کی غصیلی آواز گونجی۔ زندگی میں پہلی بار ان کا ہاتھ اُٹھا۔ "تڑاخ کی آواز آئی اور ارمان کے گال پر ماں کے تھپّڑ کے نشانات ثبت ہو گئے۔

بیگم رحمٰن نے رومال سے آمنہ کی پیشانی سے بہتا ہوا خون صاف کیا پھر ارمان کی طرف دیکھتے ہوئے غصّے سے کہا۔ "تم واقعی بدتمیز ہو اور گونگے بھی۔" ماں کا یہ جملہ سُن کر ارمان کی آنکھیں غم و غصّے سے پھیل گئیں۔ تھپّڑ کھا کر تو اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا لیکن گونگے کا لفظ سُن کر اس کی حالت اچانک عجیب سی ہو گئی تھی پھر اس کی آنکھوں میں بہت سارے آنسو آگئے۔ اس نے زور سے اپنے مٹھیاں بھینچیں اور پھر دھڑ دھڑ کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھا اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گیا۔

شام کا کھانا بھی اس نے نہیں کھایا۔ بیگم رحمٰن کھانا لے کر اس کے کمرے میں گئیں تو دروازہ تو اس نے کھول دیا لیکن ماں کو اشاروں میں بتایا کہ اسے بالکل بھوک نہیں ہے۔ اس وقت وہ بالکل

نارمل نظر آ رہا تھا۔ البتہ اس کی آنکھیں اس کے رونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ بیگم رحمٰن کا دل بھر آیا۔ انہوں نے اسے پیار کیا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے اپنے تھپڑ مارنے کی معافی مانگ لیں لیکن وہ ایسا نہ کر سکیں۔ رات جب وہ سونے لگا تو وہ اس کے کمرے میں دودھ کا گلاس رکھ آئیں اور اس سے کہا کہ وہ دودھ پی کر سوئے۔

صبح انہوں نے اٹھ کر اپنی بڑی لڑکی کی مدد سے جلدی جلدی ناشتا تیار کیا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر ارمان کے کمرے میں گئی تاکہ اسے ناشتے کے لئے اُٹھا دیں لیکن وہ کمرے میں نہیں تھا۔ بیگم رحمٰن نے دیکھا اس کا بستہ کمرے سے غائب تھا جب کہ دودھ کا گلاس بھی میز پر پلیٹ سے ڈھکا رکھا تھا۔ "رات اس نے دودھ بھی نہیں پیا"۔ بیگم رحمٰن نے سوچا۔ پھر وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں تو آمنہ نے بتایا کہ وہ کچھ دیر پہلے ہی اسکول چلا گیا ہے۔ بیگم رحمٰن کو دُکھ سا ہوا۔ آج سے پہلے وہ کبھی بغیر ناشتے کے اسکول نہیں گیا تھا لیکن کل کے ناخوش گوار واقعے نے اسے خاصا ناراض کر دیا تھا۔

تینوں بچیاں ناشتہ کرنے کے بعد اسکول اور کالج چلی گئیں۔ ان کے شوہر بھی بینک سدھارے تو وہ گھر میں اکیلی رہ گئیں۔ پہلے تو انہوں نے کچھ برتن دھوئے پھر تازہ اخبار پڑھنے لگیں لیکن ان کا دل اخبار پڑھنے میں نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی۔ کوئی دس بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بیگم رحمٰن نے فون اٹھایا دوسرے طرف سے ارمان کے پرنسپل صاحب کہہ رہے تھے۔ "بیگم صاحبہ! آپ ذرا اسکول آ جائیں اپنے شوہر کے ساتھ۔" "لیکن وہ تو گھر پر نہیں ہے، ڈیوٹی پر گئے ہیں۔" بیگم رحمٰن نے کہا پھر انہوں نے پرنسپل صاحب سے پوچھا "کیا ارمان نے کوئی بد تمیزی کی ہے۔؟"

"نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو بہت پیارا بچہ ہے دراصل ...... پرنسپل صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ آج صبح اسکول آتے ہوئے ارمان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" "نہیں!!" ریسیور ہاتھ میں تھامے بیگم رحمٰن گرتے گرتے بچیں۔ "پلیز حوصلہ رکھیں آپ بہادر خاتون ہیں۔" پرنسپل صاحب نے کہا لیکن بیگم رحمٰن پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگیں۔ ان کا پورا وجود جیسے زلزلے کا شکار تھا۔

پرنسپل صاحب نے انہیں پہلے اسکول بلایا پھر خود انہیں ہسپتال لے گئے جہاں ارمان کو ایڈمٹ کیا گیا تھا۔ بیگم رحمٰن نے اپنے شوہر کو بھی فون کر دیا تھا۔ وہ بھی ہسپتال پہنچ گئے تھے۔

بیگم رحمٰن بُری طرح رو رہی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے رک نہیں رہے تھے حالانکہ پرنسپل صاحب کئی بار کہہ چکے تھے کہ بچے کو

بہت معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ دراصل صدمے سے بے ہوش ہو گیا ہے لیکن وہ روئے جا رہی تھیں۔

جب وہ اس کمرے میں پہنچیں جہاں ارمان کو رکھا گیا تھا تو بستر پر لیٹے ہوئے ارمان کو دیکھتے ہی وہ چلّا کر رونے لگیں "میرا بچہ!!" وہ ارمان کو خود سے لپٹانا چاہتی تھیں کہ ارمان کے بستر کے قریب کھڑے ہوئے ڈاکٹر نے ان سے کہا "پلیز! حوصلہ رکھیں!"

ارمان کے ابو نے ارمان کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کے ہاتھوں پر البتہ معمولی خراشیں آئی تھیں۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا بچّہ تو بالکل ٹھیک ہے ناں؟" انہوں نے ارمان کے پورے جسم کا جائزہ لینے اور اطمینان کرنے کے باوجود فکرمندی سے پوچھا۔ "ہاں جناب! آپ کا بچّہ بالکل ٹھیک ہے بس صدمے سے بیہوش ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ جائے گا لیکن ہم اسے ایک دو دن ہسپتال میں رکھیں گے کیوں کہ شاید اس کے دماغ کے پچھلے حصّے میں کوئی چوٹ آئی ہے۔"

بیگم رحمٰن ابھی ڈاکٹر سے چوٹ کے متعلق پوچھنا ہی چاہتی تھیں کہ ارمان کو ہوش آ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ بیگم رحمٰن اس پر جُھک گئیں اور روتے ہوئے اس کا ماتھا اور منہ چُومنے لگیں۔

ڈاکٹر نے وارڈ بوائے سے کہا کہ وہ بچّے کے سر کے ایکسرے کی فلم لے کر آئے۔ وارڈ بوائے ایکسرے رپورٹ لینے چلا گیا تو رحمٰن صاحب ڈاکٹر سے گفتگو کرنے لگے۔ اسی اثنا میں بیگم رحمٰن نے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔ ارمان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چُوما۔ وہ بالکل نارمل اور ٹھیک لگ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی روشنی، کوئی چمک نہیں تھی۔ بیگم رحمٰن نے اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر دیکھا۔ سر میں کہیں چوٹ نہ تھی۔ پھر انہوں نے ارمان سے پوچھا "کچھ کھاؤ پیو گے؟" ارمان نے نفی میں گردن ہلائی۔ بیگم رحمٰن نے کہا کہ "تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ابھی دودھ منگواتی ہوں دودھ ضرور پی لینا" لیکن ارمان نے پھر نفی میں گردن ہلائی اور پھر آہستہ سے ماں کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چُھڑایا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ بیگم رحمٰن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ڈاکٹر ارمان کی ایکسرے رپورٹ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "حیرت ہے ایکسرے بالکل کلیر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا پھر سر میں چوٹ کہاں لگی ہے؟؟؟" ڈاکٹر کی یہ بات سن کر بیگم رحمٰن کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔

وہ ڈاکٹر کو کیسے بتاتیں کہ چوٹ اس کے سر میں نہیں دل پر لگی تھی ......!!!

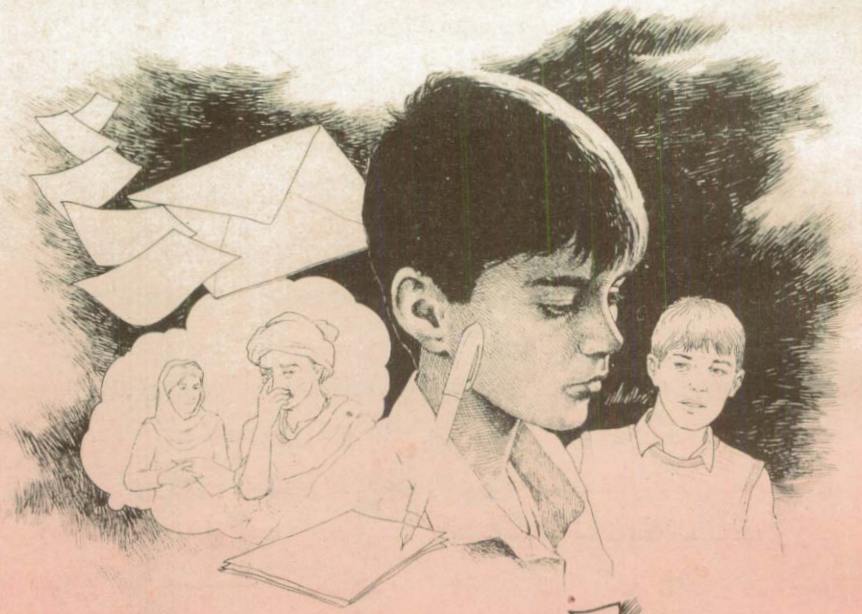

ذمہ داری

سید کاشان جعفری

تعلیم حاصل کرنا ہر بچّے کا بنیادی حق ہے

رحیمو بابا جب گزشتہ سال گاؤں سے ہو کر شہر واپس آئے تھے تو ان کے ساتھ ان کا بارہ سال کی عمر کا پوتا اقبال عرف بالے بھی تھا۔ رحیمو بابا خود ہمارے یہاں برسوں سے مالی کا کام کرتے تھے۔ وہ تو بالکل ان پڑھ تھے مگر ان کا کام بڑے تجربے کا تھا۔ کس پودے کو کون سی کھاد درکار ہے، کتنی مقدار میں اور کب پودوں کو پانی دینا چاہئے، اس کا انہیں بخوبی علم تھا اور ہمیں ان کی پڑھائی سے نہیں ان کے ہُنر سے کام تھا۔ وہ جب بالے کو لے کر آئے تھے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ میرا بھی ایک ہمجولی آگیا۔ میں اس کے ساتھ خوب کھیلا کروں گا۔ گپ بازی کروں گا۔ نت نئی شرارتیں ...... وغیرہ ...... وغیرہ ...... مگر میرا یہ خواب اُدھورا ہی رہ گیا۔ رحیمو بابا نے اسے ساتھ والے بنگلے میں ملازم رکھا دیا ...... شاید وہ گاؤں جانے سے پہلے ہی اس کے کام کی بات کر گئے تھے پڑوسی بنگلے والوں سے ...... امی نے سنا تو انہیں بہت افسوس ہوا، رحیمو بابا کو سمجھایا بھی ......

"بابا! بچّے کی عمر تو لکھنے پڑھنے کی ہے اسے ابھی سے کام پر ڈال دیا ......"

تب رحیمو بابا نے بڑے دُکھ کے ساتھ کہا تھا۔ "کیا کروں بیگم صاحبہ ...... کہتی تو آپ بھی ٹھیک ہیں۔ واقعی بالے کی عمر پڑھنے لکھنے کی ہے ...... کھیلنے کودنے کی ہے ...... مگر اس کے باپ دادا نے پڑھا ہوتا تو اسے بھی پڑھایا جاتا ...... اور پڑھ لکھ بھی گیا تو کون سی ڈگری حاصل کر لے گا یونیورسٹی سے ...... کام تو اسے محنت مزدوری کا ہی کرنا ہو گا" ...... امّی نے سمجھایا "رحیمو بابا ...... لکھائی پڑھائی.... صرف نوکری کرنے یا یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کے لئے تو نہیں کی جاتی ...... علم تو بڑے کام کی چیز ہے۔ ہر انسان کے کام آتا ہے یہ ...... ہمارے پیارے نبیؐ کی تو دُعا یہی تھی کہ ربِّ زِدنی عِلما یعنی اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما ...... پھر یہ بھی کہا کہ علم حاصل کرو، چاہئے اس کے لئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے ...... یعنی علم حاصل کرنے میں خواہ تمہیں کتنی ہی مشکلات اٹھانی پڑیں مگر علم ضرور حاصل کرو ......"

"بیگم صاحب جی ...... آپ کی بات سے انکار نہیں، مگر بالے کام نہیں کرے گا تو گزارہ کیسے ہو گا۔ میری آمدنی اتنی تو نہیں ہے۔ ابھی اس کی بڑی بہن کی شادی کرنی ہے اس کی ماں بیمار رہتی ہے، اس کی دوا علاج کا خرچہ ہے ...... اسی لئے تو اسے یہاں کام پر لگانے کے لئے لایا ہوں۔ اسے پڑھنے بٹھا دیا تو" ...... اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور الفاظ گلے میں اٹک کر رہ گئے ......

امّی نے پھر کہا ...... بابا، پڑھنے کے لئے ضروری نہیں کہ بالے کو باقاعدہ اسکول میں داخل کرائیں یہ کام پر سے آنے کے بعد شام کو وامق کے پاس بیٹھ جایا کرے، کم از کم خط لکھنا پڑھنا تو وہ بھی سکھا ہی دے گا۔ اس سے پہلے کہ رحیمو بابا اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے کھسک لیا، صاف بات تو یہ کہ مجھے امّی کی یہ بات خود بھی پسند نہیں آئی تھی کہ میں رحیمو بابا کے بیٹے کو بیٹھ کر پڑھاؤں ......

بعد میں امّی نے مجھ سے کہا بھی "بیٹے علم کا پھیلانا بھی عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ بڑی اچھی اور نیکی کی بات ہوگی اگر تمہاری کوشش سے کسی کو لکھنا پڑھنا آجائے" ...... مگر میں نے امّی کو کورا جواب دے دیا ...... "کیوں پیچھے پڑتی ہیں آپ اس کے ...... آخر آپ کو کیا مل جائے گا بالے کے لکھنے پڑھنے سے۔" اور پھر امّی نے میرا موڈ دیکھ کر کوئی بات نہیں کی ......

میں ہر روز صبح گلے میں بستہ لٹکا کے جب اسکول جانے کے لئے گھر سے روانہ ہوتا تو ٹھیک اسی وقت بالے کام پر جانے کے لئے اپنے سرونٹ کوارٹر سے باہر نکلتا ...... تو مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ مجھے اسکول

جاتے ہوئے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ کاش وہ میری جگہ شانے پر بستہ لٹکا کے اسکول جایا کرتا ...... مجھے بالے پر ترس آتا مگر خود ہی دل ہی دل میں یہ سوچ کر رہ جاتا کہ اس کے اسکول نہ جاسکنے میں میرا کیا قصور ہے!! ...... یہ تو اس کی اپنی غربت اور گھر کی مجبوریاں ہیں کہ پڑھنے لکھنے کی عمر میں ہی اسے مزدوری کرنا پڑ رہی ہے ...... امی کے کہنے پر اگر میں اسے پڑھانا شروع بھی کر دیتا تو کون سا اسے ڈاکٹر، انجینیئر یا سائنس دان بن جانا تھا۔ بہر طور مزدوری کرنا ہی تو اس کا مقدر تھا۔ جیسے اس کے باپ، دادا کرتے آئے تھے۔

دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ میں آٹھویں سے دسویں کلاس میں پہنچ گیا تھا۔ بالے نے بھی تنخواہ کی مد میں خاصی ترقی کر لی تھی۔ اب وہ پانچ سو روپیہ ماہوار کے بجائے آٹھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ لینے لگا تھا۔ اس دن شام کے وقت کلب سے بیڈمنٹن کا میچ کھیل کر لوٹا تھا۔ امی لان میں شام کی چائے پی رہی تھیں۔ وہیں رحیمو بابا سر جھکائے کھڑے تھے۔ بالے بھی ان کے ساتھ تھا۔ امی نے رحیمو بابا سے پوچھا تھا کہ وہ اداس اور رنجیدہ سے کیوں نظر آرہے ہیں اور جواب میں بابا نے کہا، کیا بتاؤں، بیگم صاحب جی ...... دوپہر کی ڈاک سے ایک خط آیا تھا گاؤں سے ...... بالے کی ماں سخت بیمار ہے۔ ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے۔ باپ نے اس کے علاج پر پانچ سو روپیہ اور بچوں کے لئے کپڑے وغیرہ کے لئے لکھا تھا۔"

"پھر؟" ...... امی نے سوال کیا۔

"پھر کیا، بیگم صاحب جی ...... شبراتی جو میرے گاؤں کے پڑوس کے دوسرے گاؤں میں رہتا ہے اسی کے ہاتھ پانچ سو روپیہ اور بچوں کے لئے کپڑا خرید کر بھجوا دیا ہے ...... وہ اپنے گاؤں جا رہا تھا، ہمارے گاؤں جا کر پیسے اور کپڑے بھی پہنچا دے گا۔" ...... اس نے امی کو جواب دیا۔

"مگر خط پڑھوانے کے لئے تم میرے پاس تو آئے نہیں ...... کس سے سنا خط؟" امی نے کسی وکیل کے سے انداز میں جرح کی۔

وہ جس وقت خط آیا۔ شبراتی میرے پاس پہلے سے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ گاؤں جانے سے پہلے ملنے آیا تھا مجھ سے۔" رحیمو بابا نے کہا۔ "اسی سے خط پڑھوا کر سنا تھا۔ وہ پڑھنا لکھنا جانتا ہے ...... لیجئے آپ بھی خط دیکھ لیجئے۔" اس نے اپنے کرتے کی جیب سے وہ خط نکال کر امی کی طرف بڑھا دیا۔

امی خط پڑھنے لگیں، ان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ پیشانی پر بل سے پڑ گئے۔ پھر خط ختم کر کے بولیں "رحیمو بابا ...... اس میں تو کہیں بالے کی ماں کے بیمار ہونے کا نہیں لکھا ہے ...... نہ ہی بچوں کے لئے کپڑے منگوانے کی کوئی بات ہے ...... اس میں تمہارے بیٹے نے لکھا ہے ...... کہ گھر

میں سب خیریت سے ہیں۔ اس بار فصل اچھی ہوئی ہے اور پیسے بھی اچھے ملے ہیں۔ نصیبن کے لئے سونے کی دو دو چوڑیاں اور کانوں کے لئے بالیاں بنوالی ہیں، تم نے جو منی آرڈر بھیجا تھا، اس رقم سے نئے لحاف اور کپڑے بنوا لئے ہیں۔ اور سب خیریت سے ہیں۔

خط سنا کر امّی کچھ سوچتے ہوئے بولیں، "میرا خیال ہے کہ تمہارے دوست شبراتی نے تمہیں بیوقوف بنایا ہے تمہارے گھر کی مجبوری کا فرضی واقعہ سنا کر وہ تم سے پانچ سو روپیہ نقد اور کپڑے لے کر چلتا بنا ہے....."

"کیا..... بیگم صاحب جی!"..... رحیمو بابا نے حیرت سے پوچھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے.....

اب تک میں بھی ساری بات سمجھ چکا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ "لوگ سادہ لوح اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا یوں بھی استحصال کرتے ہیں۔ اس طرح بھی ان کو ٹھگا جاتا ہے"..... پھر دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے مجرم ہونے کا احساس ہونے لگا..... میں سوچ رہا تھا کاش میں نے امّی کی بات مان لی ہوتی ..... ان دو سالوں میں بالے کو کم از کم خط پڑھنا تو سکھا ہی دیتا..... مجھے احساس ہو رہا تھا کہ "علم حاصل کرنا ان بچّوں کا بھی حق ہے..... جو محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اگر ہر پڑھا لکھا شخص ایک ایک بچّے کو ہی پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر لے تو پھر وطن میں کوئی بھی بچہ جاہل نہیں رہے گا"۔

سزا اور شفقت

ایک مرتبہ بہت سے مجرموں کو حجاج کے سامنے لایا گیا۔ اور ان کو ایک ایک کر کے سزا دی جانے لگی۔ حجاج یہ منظر دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ یہ دیکھ کر ایک مصاحب نے عرض کی "امیر کی عمر دراز ہو اگر یہ سزا جائز ہے تو اس شفقت کے کیا معنی؟ اور اگر شفقت بجا ہے تو اس سزا کی کیا ضرورت ہے؟" حجاج نے جواب دیا "بنی آدم کی زندگی بنی آدم کی ہلاکت میں پنہاں ہے۔ لیکن حکمرانوں کے لئے سزا کے ساتھ شفقت بھی ضروری ہے، جیسا کہ بزرگوں کا قول ہے کہ بادشاہ سر کی طرح ہوتا ہے اور رعایا اعضا کی طرح۔ اگر کبھی سر کی بقا کے لئے کسی عضو کو کاٹنا پڑے تو سر کو بھی رنج ہوتا ہے۔ بادشاہ کو چاہئے کہ سزا کی مصلحت کے ساتھ ساتھ غریب رعایا کی حالت پر کڑھے بھی تاکہ قیامت کے دن ماخوذ نہ ہو کہ زمانہ بدلنے والی اور گزرنے والی چیز ہے۔" یہ سن کر ایک بوڑھا مجرم اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ یا امیر ہم تو اپنے جرم کی بنا پر سزا کے قابل ٹھہرے مگر آپ عفو کی بدولت رحمت کے مستحق نہ ہوئے۔" حجاج کو یہ بات پسند آئی اور اس نے حکم دیا کہ اس کے طفیل باقی مجرموں کی بیڑیاں بھی کھول دی جائیں۔ پھر بولا "اگر تو یہی بات پہلے کہہ دیتا تو میں سب کو معاف کر دیتا۔"

مرسلہ..... میمونہ بی بی، ملتان

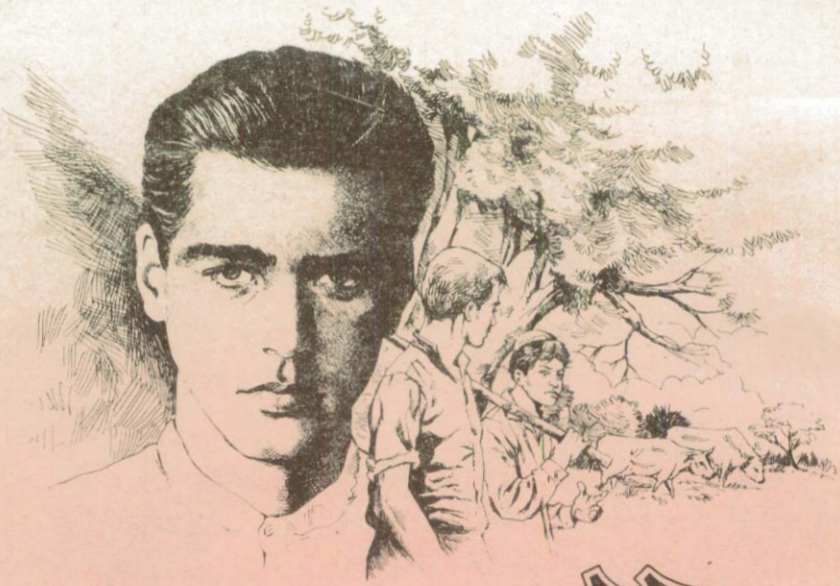

جبی

محمد عارف عثمان

زندگی کے کم از کم معیار کے مطابق سہولتیں دینا بچّے کے ماں باپ کی پہلی ذمّہ داری ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس ذمّہ داری کو پورا کرنے میں ماں باپ کی مدد کرے۔

"بات سنو بھائی!" میں نے بھینسوں کو ہانکنے والے لڑکے کو آواز دی۔

"آپ نے مجھے بلایا ہے؟" اس نے میرے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"السلام علیکم۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو غور سے دیکھا پھر اپنی میلی سی قمیض کے ساتھ رگڑ کر صاف کیا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مسکراتا ہوا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ بھینسوں کو چرانے کے لئے کھیت میں لے کر جا رہا تھا۔ ہمارے ارد گرد کھیت ہی کھیت تھے۔ بھینسوں کے گلوں میں لٹکتی گھنٹیاں مسلسل ٹن ٹن کر رہی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ

پکڑے لنگوٹیئے دوستوں کی طرح، بھینسوں کے پیچھے چل رہے تھے۔ میں نے اسے ذرا بھی محسوس نہ ہونے دیا کہ اس کے کپڑے میلے کچیلے، گوبر کے دھبّوں سے لتھڑے ہوئے ہیں اور میں نے صاف ستھری پینٹ شرٹ پہن رکھی ہے۔

"ہاں! تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے بے تکلّفانہ انداز سے پوچھا۔ "ججّی" اِس نے میٹھے لہجے میں بتایا۔

"ججّی؟ یہ کیا نام ہوا بھلا؟" میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"بس جی ...... مجھے تو ججّی ہی کہتے ہیں سارے، مجھے بھی اچھا لگتا ہے"۔

"بھئی وہ تو ٹھیک ہے، مگر تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"

"بتایا تو ہے آپ کو!" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں ججّی! میرا مطلب ہے تمہارا وہ اصلی نام جو تمہارے امّی، ابّا نے رکھا تھا۔ یہ ججّی کوئی اصلی نام تو نہیں ہے ناں۔" وہ پھر ہنسا، ذرا ٹھہر کر بولا،

"ججی ہی میرا اصلی نام ہے جی، اپنے کسی اور نام کا مجھے نہیں پتا، آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بس ...... ججّی ویسے ہی ...... یونہی۔" میں اس کے اچانک سوال پر بوکھلا کر رہ گیا "اچھا! تم اسکول پڑھنے جاتے ہو؟" میں نے بات کا رخ بدلا۔ "اسکول تو پاگل ہی پڑھنے جاتے ہیں"۔ ججّی نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہیں؟؟ ...... پاگل؟؟ ...... میں کچھ سمجھا نہیں ججّی؟"

"تو اور کیا جی؟ میرے چاچے کا لڑکا بارہ جماعتیں پڑھا ہوا ہے۔ بہت خجل خراب ہوا، نوکری نہیں ملی اب گھر بیٹھا ہے۔ ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا تو پوری چودہ جماعتیں پاس ہے مگر بے کار پھرتا ہے۔ کئی اور لڑکے بھی ہیں۔ جن کو دیکھ کر ابا کہتا ہے تو بھینسیں ہی چرایا کر، پڑھ لکھ کر کیا کرے گا۔ اس کے باوجود کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی اسکول جایا کروں، اچھے اچھے کپڑے پہنوں، صاف ستھرا رہوں، یہ گندے مندے سے کپڑے مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ لیکن میرا ابّا۔" ...... اس نے رنجیدہ سا ہو کر کہا۔

اتنے میں وہ کھیت آگیا جس میں اس کو بھینسیں چرانی تھیں۔ اس نے اِدھر اُدھر سے ہانک کر بھینسوں کو کھیت میں داخل کر دیا۔ وہ بھوکی تھیں۔ کھیت میں گھُستے ہی جلدی جلدی منہ مارنے لگیں۔ ججّی اور میں ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئے۔

"ججّی! تم کون سا کھیل کھیلتے ہو؟"

"پہلے ہم چور سپاہی کھیلا کرتے تھے اب گیند بلّا کھیلتے ہیں۔ لیکن یہ بھی کہاں کھیلتے ہیں؟ کوئی جگہ ہی نہیں کھیلنے کی"۔

"کیوں؟ کھیل کا میدان نہیں ہے یہاں؟"

"تھا تو!"
"تھا تو پھر؟؟؟"
"اسے چوہدریوں نے مل کر کھیت بنا لیا ہے"۔ اس نے اُداسی سے بتایا۔
"مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟؟"
"ان کی مرضی جی! کہتے ہیں اس سے ہماری زمین، فصل اور دولت میں اضافہ ہو گا۔ نہ کوئی بولا، نہ کسی نے ان کو روکا"۔ وہ اب بھی اداسی سے بول رہا تھا۔
"پھر، اب یہاں کے بچّے کیا کھیلتے ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں کھیلتے جی! آوارہ پھرتے رہتے ہیں، وی سی آر دیکھتے ہیں اور......"
"اور کیا؟"
"میری عمر کی دو تین لڑکے ہیروئین پیتے ہیں۔ باقی انہیں دیکھتے ہیں۔ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور کبھی کبھار ان پر ٹھنڈے پانی کی بالٹیاں پھینکتے ہیں"۔
"وہ لڑکے، ہیروئین کہاں سے لیتے ہیں؟"
"چوہدری خود بیچتے ہیں جی"۔
"کیا؟؟"
"ہاں جی! آپ میرا نام نہ لینا کہیں"۔
"لو یار ججی! میں کیوں لوں گا تمہارا نام؟"
"آپ! ایک بات بتائیں گے؟"
"ہاں، ہاں......! تم پوچھو! سو باتیں پوچھو!!"
"آپ نے مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھی ہیں؟"
"اس لئے بھائی! کہ ...... وہ ...... بس یونہی"
...... میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے اور اس جیسے دوسرے پاکستانی بچوں کے حقوق، مسائل و پریشانیوں اور ان کے حل کے حوالے سے مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ میں لکھنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے بچے بیمار، کمزور، کند ذہن، بے چین اور اداس و پریشان کیوں رہتے ہیں؟ ان کو ان چیزوں سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟
میں یہ باتیں ججی کو بتا کر اسے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔
کیونکہ مجھے معلوم ہے میرے یا کسی اور کے مضمون لکھ دینے سے پاکستان کے بچوں کو ان کے حقوق نہیں مل جائیں گے۔ نہ ان کے مسائل حل ہوں گے نہ حکومت کچھ کرے گی۔ معاشرہ تو یہ بالکل نہیں سوچے گا کہ بچوں کو ان کے حقوق دینے چاہئیں۔
بچوں کے لئے کام کرنے والے اداروں اور تنظیموں نے حسب روایت چپ ہی سادھے رکھی ہے۔ تو پھر میں ایک بے فکر بچے کو کیوں فکر مند کرتا؟؟؟
ججی مسلسل مجھے تک رہا تھا۔
"آپ نے بتایا نہیں کہ ......" اس نے پھر پوچھا۔
"ہاں، ہاں، ججیؔ! ......" میں اپنی حالت کے

برعکس جھوٹ موٹ مسکراتے اور اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "...... بس مجھے ناں، اپنے ملک کے بچوں سے محبت ہے۔ میں یونہی کبھی کبھی کسی طرف نکل جاتا ہوں اور کسی بچے سے باتیں کرتا ہوں، جیسے آج تم سے کی ہیں۔ اس سے مجھے خوشی ہوتی ہے"۔

"اچھا! تو یہ بات ہے"۔ ججی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ججی! یہ بات ہے" میں بڑی مشکل سے کہہ پایا ...... "ٹھیک؟ اب میں چلتا ہوں"۔

"آپ کی مرضی"۔ ججی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے اس سے پُرجوش طریقے سے ہاتھ ملایا اور چل پڑا۔ اب میں ایک اچھا مضمون لکھ سکتا ہوں۔ مضمون کا نام کیا ہو گا بھلا؟ ہاں! "ججی"۔

■

یونیسیف بچوں کا دوست، بچوں کا محسن

مرسلہ: محمد نعمان اصغر فیصل آباد

دنیا بھر کے بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے جنرل اسمبلی کی سفارش پر ۱۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ایک عالمی ادارہ قائم ہوا۔ اس کا نام اقوام متحدہ ادارۂ اطفال (یونیسیف) رکھا گیا یونیسیف بچوں کی صحت، رہائش اور خوراک کا بہتر بندوبست کرتا ہے۔ اس کا صدر دفتر نیویارک میں قائم کیا گیا اور اس کی مختلف شاخیں دنیا بھر کے (۱۳۰) ممالک میں قائم ہوئیں۔ جلد ہی اس ادارے نے دنیا بھر کے بچوں کے لئے ترقیاتی کاموں میں امداد دینی شروع کی اور بچوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے منصوبے بنانے شروع کئے۔ ظاہر ہے اس کے لئے انہیں رقم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یونیسیف اشتہاری ٹکٹ چھاپے اس کے علاوہ اسے مختلف ملکوں سے عطیات ملے اور رضا کارانہ طور پر چندے بھی حاصل ہوئے اقوام متحدہ کا معاشرتی اور اقتصادی ادارہ بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ یہ ادارہ نیم خود مختار ہے۔

یونیسیف کی انتظامیہ (۳۰) ارکان پر مشتمل ہے۔ یہ ارکان دنیا کی تیس مختلف اقوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔

یونیسیف نے ۱۹۵۰ء میں بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے فنڈ میں اضافہ کیا۔ زچہ و بچہ کے صحتی مراکز قائم کئے، ہسپتال اور کلینک بنائے اور ان کے لئے دوائیں بھی فراہم کیں۔ یہ ادارہ .... ۱۹۶۱ء میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور ۱۹۶۷ء میں خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مختلف ممالک کو امداد بھی دینے لگا۔ یونیسیف نے بچوں کی مختلف بیماریوں کے خلاف جہاد کیا، خصوصاً چیچک اور تپ دق کے خلاف اس ادارے نے خصوصی مہم چلائی۔ یہ ادارہ ۱۹۴۸ء سے پاکستان کو بھی امداد دے رہا ہے اور اب تک بچوں کی دیکھ بھال کے لئے یہ ادارہ کروڑوں روپے ہمارے ملک کو فراہم کر چکا ہے۔ کراچی اور لاہور کے ملک پلانٹ کے لئے بھی اس ادارے نے تعاون کیا اور مختلف آلات مہیا کئے۔ امن ہو یا جنگ زلزلہ ہو یا سیلاب کسی بھی آفت میں اس ادارے کے رضا کار بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے ہیں۔ بے شک ہم سب کو اس ادارے پر ناز ہے جو رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر بچوں کی مدد کرتا ہے۔ بچوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں بہترین خدمات انجام دینے پر یونیسیف کو ۱۹۶۵ء میں نوبل پرائز بھی دیا جا چکا ہے

انعامی مقابلہ

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا

۱۔ ایک عشائیے میں رمضان، قیصر، حیدر اور رحیم کی ملاقات ہوئی۔ کھانے کے بعد ان میں سے ہر ایک نے غلطی سے کسی دوسرے ساتھی کا ہیٹ لے لیا۔ کھانے کے دوران رمضان اُس شخص کے مقابل بیٹھا تھا جس نے رحیم کا ہیٹ لیا۔ حیدر اُس آدمی کے سامنے بیٹھا تھا جس نے رمضان کا ہیٹ لیا۔ کھانے کے بعد رحیم اور حیدر اکھٹے واپس گھروں کو گئے مگر ان دونوں نے ایک دوسرے کا ہیٹ نہیں لیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کس نے کس کا ہیٹ لیا؟

۲۔ پرویز اور فاروق کے پاس دو خراب گھڑیاں ہیں۔ ایک صبح دونوں گھڑیوں کا وقت ملایا گیا۔ ٹھیک چھ بجے تھے۔ پرویز کی گھڑی ایک گھنٹے میں پانچ منٹ آگے جاتی ہے جب کہ فاروق کی گھڑی ایک گھنٹے میں پانچ منٹ پیچھے جاتی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دونوں گھڑیوں میں دوبارہ بالکل صحیح ایک ساوقت کب ہو گا؟

۳- بندو کے بندر کیساتھ عجیب مسئلہ ہے جب وہ کسی درخت پر چھ میٹر اوپر کی جانب چڑھتا ہے تو دو میٹر نیچے پھسل جاتا ہے۔ اگر ایک درخت چھبیس میٹر اونچا ہو تو بتائیے بندر کو درخت کی چوٹی تک پہنچنے سے پہلے کتنا فاصلہ طے کرنا ہو گا؟

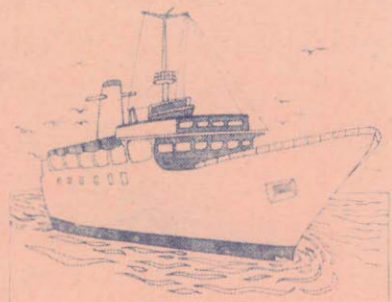

۴- ایک بحری جہاز سمندر میں سفر کر رہا تھا۔ ایک صبح چھ بجے سمندر میں جہاز سے باہر کی سطح ۱۵۰ سینٹی میٹر نوٹ کی گئی۔ لہروں کی اونچائی میں ۵ سینٹی میٹر فی گھنٹہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا تھا۔ بتائیے نو بج کر بیس منٹ پر پانی کی سطح کیا ہو گی؟

اس مقابلے میں ہم آپ سے حسابی نوعیت کے اور کامن سنس کے صرف چار سوالات پوچھتے ہیں۔ بالکل صحیح جوابات دینے والے ذہین ساتھی کو ایک عدد **کیلکولیٹر** انعام کے طور پر دیا جاتا ہے۔ زیادہ تعداد میں صحیح جوابات موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جاتا ہے۔

مقابلے میں شرکت کی شرائط حسبِ ذیل ہیں (1) جوابات واضح، صاف اور خوش خط لکھئے (2) جوابات ماہِ رواں کی ۱۲ تاریخ تک ادارے کو موصول ہو جائیں (3) بالکل الگ لفافے میں الگ کاغذ پر صرف جوابات اور بھیجنے والے کا مکمل پتہ درج ہو، تاخیر سے اور پتے کے بغیر موصول ہونے والے خطوط مقابلے میں شریک نہیں کئے جائیں گے؛

(پتہ) انچارج انعامی مقابلہ "امتحان ہے آپ کی ذہانت کا" — ماہنامہ "آنکھ مچولی" ا-پی آئی بی کالونی، کراچی

گزشتہ ماہ کے سوالوں کے درست جوابات:۔

۱)۔ آدھے منٹ کے بعد ٹرین کا اگلا حصہ سرنگ سے باہر آنا شروع ہو گا۔ بقیہ ٹرین سرنگ میں سے ایک منٹ میں گزرے گی۔ یوں مجموعی طور پر پوری ٹرین کو سرنگ میں سے پار ہونے میں ایک منٹ اور تیس سیکنڈ کا عرصہ لگے گا۔

۲)۔ سب بچے ۱۹۵۸ میں پیدا ہوئے۔

۳)۔ پہلے نل کے ذریعے ایک گھنٹے میں جتنا ٹب بھرتا ہے = ۱/۳

دوسرے نل کے ذریعے ایک گھنٹے میں جتنا ٹب بھرتا ہے = ۱/۴

سوراخ کے ذریعے ایک گھنٹے میں جتنا ٹب خالی ہوتا ہے = ۱/۶

یوں ایک گھنٹے میں جتنا ٹب بھرے گا = ۵/۱۲ = ۱/۶ - ۱/۴ + ۱/۳

لہٰذا پورا ٹب بھرنے میں وقت صرف ہو گا = ۱/۵ ۲ = ۱۲/۵

یا دو گھنٹے چوبیس منٹ۔

۴)۔ بائیں طرف کی تیلی کو تھوڑا سا بائیں طرف کھسکایئے۔ اس طرح تیلیوں کے درمیان میں ایک چھوٹا سا مربع بن جائے گا۔

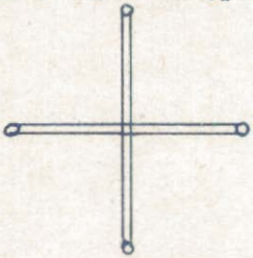

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب ساتھی کا نام:۔

محمد عمران، لالہ موسیٰ۔

بالکل درست جواب ارسال کرنے والے ذہین ساتھی۔

آصف علی جان، کامونکی۔ رانا شمیں احمد، کامونکی۔ شگفتہ رانی، راولپنڈی۔ طاہر نعیم راجو، راولپنڈی۔ محمد کامران، لاہور۔ انعم آصف، لاہور۔ محمد عمران، لاہور۔ سعید انور، لاہور۔ محمد فیاض اختر، لاہور۔ محمد یوسف ناز، لاہور۔ کاشف محمود، گوجرانوالہ۔ رابیل اختر، لاہور۔ ناہید اختر، لاہور۔ ابتسام ساجد، کمالیہ۔ محمد عثمان مسعود، اسلام آباد۔ محمد علی یاسین، حیدر آباد۔ محمد اعجاز پرنس، راولپنڈی۔ محمد یحییٰ، کراچی۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھی:۔

صائمہ، کراچی۔ قیصر اقبال، کراچی۔ تمکین بخرا، کراچی۔ محمد اشرف اصغر، رحیم یار خان۔ پرنس گل سومرو، گھوٹکی۔ ساجد کمالوی، کمالیہ۔ عمران بشیر، کراچی۔ سیدہ تابندہ حسنین، لاہور۔ احمر فرقان، ملتان۔ سبین پرویز، اسلام آباد۔ وقار عظیم، بہاولپور۔ امبر خان، کراچی۔ مریم خالد، اسلام آباد۔ اظہر کمال، کراچی۔ اعجاز احمد شاہین، سرگودھا۔ آغا ماریہ ثروت، آغا عدیل مرزا، آغا عمران مرزا، آغا ذیشان مرزا، آغا فیصل مرزا، کوئٹہ۔ شہلا حسین، واہ کینٹ۔ سلیم رضا، لاہور۔ نعمان احمد خان، کراچی۔ اسامہ آصف حسن، کراچی۔ مرزا کرن بیگ، مرزا عمران بیگ، مرزا فرحان بیگ، مرزا سلمان بیگ، مرزا عدنان بیگ، مرزا ریحان بیگ، مرزا فرقان بیگ، مرزا کامران بیگ، حیدر آباد۔ محمد طاہر جمیل، کراچی۔ نواب مرزا زور آور بیگ، نواب مرزا زوار بیگ، نواب مرزا دلاور بیگ، نواب مرزا کرن بیگ، نواب مرزا ماہین بیگ، اسلام آباد۔

ایک سے زیادہ غلط جواب دینے والے ساتھی:۔

محمد منیر احمد، کراچی۔ علی احمد سلیم، کراچی۔ حاذر حمان، کراچی۔ عرفان احمد شبیر، کراچی۔ منصور شعیب، کراچی۔ فاریہ تقدیس، اٹک۔ حاجی شہزاد حسین اعوان، ملتان۔ حمیرا تبسم، ٹھٹھہ۔ محمد راحیل بن یحییٰ، حیدر آباد۔ امان اللہ، عظمیٰ نورین، اوکاڑہ۔ امجد بشیر، آزاد کشمیر۔ ظفر اللہ خان شیزی، گجرات۔ فراز فہیم کراچی۔ سیّد شہزاد واسطی، لاہور۔ محمد زاہد، حیدر آباد۔ عبدالستار خان طاہر، بورے والہ۔ ارشد علی ارائیں، شکار پور۔ یوسف فاروق، رسالپور۔ محمد عظیم قریشی، کمالیہ۔ خواجہ محمد اقبال ارائیں، ملتان۔ زاہد حسین انصاری، کراچی۔ رانا محمد آصف خان، بھکر۔ احمد حسین اتحادی، عبدالحکیم۔ انیٰ حسنات، کمالیہ۔ چوہدری محمد قاسم گورایہ، چوہدری حماد الرحمن گورایہ، زر افشاں گورایہ، نگہت میمونہ سحر، گوجرانوالہ۔ گل زرین مغل، ایبٹ آباد۔ اکرم پاشا میمن، سجاول۔ ساجد حسین، قاسمی، کراچی۔ محمد صابر، کراچی۔ عبدالسلام عاطف، لاہور۔ زبیر عامر خان، فیصل آباد۔ نواب علی پریمی، سانگھڑ۔ محمد شکیل، دادو۔ انیل کمار آزاد، راجو کھانانی۔ صائمہ کنول، عظمیٰ کنول، حیدر آباد۔ یاسر عدنان، لاہور۔ احمد حسن صدیقی (؟) کاشف ریاض، لاہور۔ اویس اقبال، کراچی۔ افشاں غوری، حیدر آباد۔ انیلا سیف، کراچی۔ عدنان احمد صدیقی، کراچی۔ مہرین اختر، سرگودھا۔ حافظ رفاقت علی، سرگودھا۔ شفقت علی شاہین، سرگودھا۔ محمد افتخار شیرازی، ٹنڈو آدم۔ مصحف رسول، کراچی۔ محمد زمان وسان، سانگھڑ، ولی محمد سانگھڑ۔ فہد عمران، کراچی۔ سیّد سعد احمد، بہاولنگر۔ مجاہد حسین، کراچی۔ احسان الرحمٰن خالد، لاہور۔ ارم فاطمہ، سکھر۔ ضیاالدین بٹ، لاہور۔ راحیل رشید، کراچی۔ دلیپ کمار جیوتانی، رتو ڈیرو۔ کاشف ریاض، لاہور۔

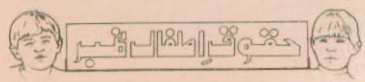

ایک ایئرہوسٹس اپنی فلائٹ کے مسافروں میں چیونگم تقسیم کر رہی تھی جس کے پیکٹ پر لکھا ہوا تھا:
"طیارہ اڑنے اور اُترنے کے وقت کانوں کو انجن کے شور سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے استعمال کیجئے۔"
ایک خاتون مسافر نے دورانِ پرواز ایئرہوسٹس کو پاس بُلا کر کہا "اس چیونگم کو میرے کانوں سے نکالئے یہ تو چپک گئی ہے۔ مجھ سے نکل نہیں رہی۔"

مرسلہ ...... محمد یونس حسین، کراچی۔

ایک امریکی اخبار نے اپنے رپورٹر کو سمندر کے سفر پر بھیجا۔ جس روز جہاز فرانس کی بندر گاہ پر لنگر انداز ہوا، اس روز بڑے زور کا طوفان آیا۔ جس سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی اِخبار کا ایڈیٹر بڑا خوش تھا کہ اب تباہی کی بڑی گرما گرم خبریں اس کے اخبار میں چھپیں گی کیونکہ صرف اس کے اخبار کا نمائندہ وہاں موجود تھا۔ ایڈیٹر کو تار کا شدّت سے انتظار تھا۔ بالآخر رات گئے تار موصول ہوا جس میں لکھا تھا،
"میں بخیرت ہوں۔ فکر مند نہ ہوں۔"

مرسلہ ...... نثار احمد خان، پنو عاقل۔

چچا ...... "بیٹا سعید آج کل کیا کر رہے ہو؟"

سعید ...... "چچا بی کام کر رہا ہوں۔"
چچا ...... "بیٹا کام کوئی بھی کرو لیکن پڑھائی مت چھوڑنا۔"

مرسلہ ...... برکت علی ہزارہ، سانگھڑ۔

ایک امیر آدمی علاج کے لئے ایک کلینک پر گیا۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا "کرسی پر تشریف رکھئے جناب!"
امیر آدمی کو یہ توقع تھی کہ ڈاکٹر اسے دوسرے لوگوں کی نسبت اچھی نگاہ سے دیکھے گا۔ اس لئے ڈاکٹر سے کہا،
"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں اس شہر کا امیر ترین آدمی ہوں۔"
"تو پھر آپ دو کرسیوں پر تشریف رکھئے۔"
ڈاکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ ...... عشرت بانو ریاض احمد، کراچی۔

استاد شاگرد سے "آج تم دیر سے کیوں آئے ہو۔"

شاگرد...... "جناب راستے پر بورڈ لگا تھا جس پر لکھا ہوا تھا "آگے اسکول ہے آہستہ چلیں!!!"

مرسلہ...... نور احمد، روہڑی

ایک امریکی اور ولندیزی باتیں کر رہے تھے۔ امریکی نے پوچھا، "تمہارا جھنڈا کیسا ہے؟" ولندیزی نے کہا کہ اس پر لال، سفید اور نیلی پٹیاں ہیں جو ہمارے ٹیکس کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ٹیکسوں کا ذکر آتا ہے تو ہم سرخ ہو جاتے ہیں۔ ٹیکسوں کے بل وصول ہوتے ہیں تو ہم سفید ہو جاتے ہیں اور ٹیکس ادا کرتے کرتے ہم نیلے پڑ جاتے ہیں۔ امریکی نے کہا "یہی حال ہمارا ہے۔ دن ہو یا رات ہمیں تو تارے ہی تارے نظر آتے ہیں۔"

مرسلہ...... نوشین مختار رانا، رحیم یار خان۔

کوئی روسی جب ریل سے اترتا ہے تو چلتے وقت مڑ کر ڈبے میں دیکھتا ہے کہ کہیں اس کا سامان سیٹ پر تو نہیں رہ گیا۔ امریکی پیچھے دیکھے بغیر ہی آگے بڑھ جاتا ہے مگر کوئی اسرائیلی جب ٹرین سے اترتا ہے تو چلتے وقت مڑ کر ضرور دیکھتا ہے۔ اس لئے کہ کہیں کسی اور کا سامان تو گاڑی میں نہیں رہ گیا۔

مرسلہ...... عبدالوحید، کراچی۔

"تمہاری زندگی کے صرف چند منٹ باقی رہ گئے ہیں۔" پرائیویٹ اسپتال کے وارڈ بوائے نے مریض کو بتایا۔

"کیا تم میرے لئے کچھ کر سکتے ہو؟" مریض نے پُر اُمید نظروں سے وارڈ بوائے کی طرف دیکھا۔

"ہاں اس مختصر سے وقت میں، میں تمہارا بل تیار کر سکتا ہوں۔" وارڈ بوائے نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ...... عبدالوحید، کراچی۔

ایک مصروف ترین اسٹیٹ ایجنٹ دو خواتین کو جمعہ کا پورا دن کرائے کے مکانات دکھاتا ہوا تیسویں مکان پر پہنچا۔ "یہ بیڈروم ہے، یہ کچن ہے، یہ ڈرائنگ روم ہے، یہ اٹیچ باتھ، یہ ٹی وی لاؤنج اور یہ ہابی روم ہے۔"

پھر ایجنٹ نے عاجزی سے خواتین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بھی یقیناً کوئی نہ کوئی ہابی ہوگی؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔" ایک خاتون نے جواب دیا۔ "جمعہ کے دن کرائے کے مکان دیکھنا۔"

مرسلہ...... عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ

ایک ہوٹل کی انتظامیہ نے اعلان کیا کہ جو شخص ۱۰۰ روٹیاں ایک ساتھ کھائے گا اسے ۱۰،۰۰۰ روپے انعام نقد دیا جائے گا۔ یہ سن کر ایک شخص ہوٹل پہنچا اور روٹیاں کھانے کا دعویٰ

کیا۔ چنانچہ مقابلہ شروع ہوا۔ وہ شخص روٹیاں کھاتا رہا یہاں تک کہ ۹۰ روٹیاں کھا گیا یہ دیکھ کر ہوٹل والے پریشان ہو گئے۔ لہٰذا انہوں نے اسکور بورڈ پر روٹیوں کی تعداد گھٹا دی۔ کافی دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا تو وہ شخص چلاّ اٹھا۔ "یہاں بے ایمانی ہو رہی ہے۔ مقابلہ دوبارہ شروع ہو گا۔"

مرسلہ ...... اسامہ آصف حسن، کراچی۔

استاد (شاگرد سے) ...... "بتاؤ کپاس کس کام آتی ہے؟"

شاگرد ...... "معلوم نہیں جناب۔"

استاد ...... "کمال ہے۔ تمہارا لباس کس طرح بنا ہے؟"

شاگرد ...... "ابّا جان کے لباس کو چھوٹا کر کے۔"

مرسلہ ...... اسامہ آصف حسن، کراچی۔

جب ایفل ٹاور کی تعمیر ہو رہی تھی تو اس وقت اس کی تعمیر کی مخالفت میں بھی بہت سے لوگ تھے۔ جب عمارت تعمیر ہو گئی تو اس میں موجود ایک ریسٹورینٹ میں، ایک صاحب روزانہ آ کے کافی دیر تک بیٹھے رہتے حالانکہ وہ ایفل ٹاور کی تعمیر کے خلاف تھے۔ یہ دیکھ کر ایک صاحب نے ان سے استفسار کیا۔ "کیوں جناب! آپ تو اس عمارت کی تعمیر کے سخت مخالف تھے۔ پھر روز یہاں آنے کا کیا مطلب ہے۔" یہ سن کر وہ صاحب بولے۔ "دراصل بات یہ ہے کہ سارے شہر میں یہی ایک جگہ ہے جہاں سے یہ منحوس عمارت نظر نہیں آتی۔"

مرسلہ ...... اسامہ آصف حسن، کراچی۔

ایک شخص نے مٹھائی کی دُکان کھولی۔ جب اسے ایک ملازم کی تلاش ہوئی تو ایک دوست نے پوچھا۔ "تمہیں کیسا ملازم درکار ہے، نیا، پرانا، منجھا ہوا، بوڑھا یا جوان؟" وہ شخص کہنے لگا۔ "ان سب باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ امیدوار صرف ایک شرط پوری کرتا ہو کہ وہ شوگر کا مریض ہو۔"

مرسلہ ...... اسامہ آصف حسن، کراچی۔

ماں (بچے سے) تمہیں معلوم ہے بڑے جھوٹ بولیں تو کیا ہوتا ہے؟

بچہ . "ہاں اماں! پھر ان کے بچے بس میں آدھے ٹکٹ پر سفر کرتے ہیں"۔

مرسلہ: ساجد خان، کراچی۔

ایک صاحب بس میں داخل ہوئے اور رعونت سے کنڈیکٹر سے پوچھنے لگے

"کیا بس میں سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟"

"نہیں"! کنڈیکٹر نے جواب دیا۔

"اگر نہیں تو یہ بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے کس نے پھینکے ہیں"؟

"انہوں نے پھینکے ہیں جو سوالات پوچھنے کے عادی نہیں"۔ کنڈیکٹر نے جواب دیا۔

عبدالرزّاق سولنگی، روہڑی

"رات مشتاق اور ظفر میں خوب دھینگا مشتی ہوئی۔"

"حیرت ہے۔ وہ تو ایک جان دو قالب تھے۔"

"اسی وجہ سے تو انہیں ایک دوسرے سے جُدا کرنے میں دس آدمیوں کو زور لگانا پڑا"۔

مرسلہ: راشد خان، کراچی

ایک آدمی ٹرین پر سفر کے دوران اکیلا پوری سیٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک آدمی آیا اور کہا"سیٹ سے اٹھو"، اس نے کہا کہ تمہیں پتہ نہیں میں کون ہوں وہ ڈر گیا اور چلا گیا دوسرا آدمی آیا اس نے بھی وہی کہا اور وہی جواب سنا۔ ایک پہلوان آیا اور اس نے کہا"اٹھو سیٹ سے"۔ اس نے کہا"تجھے پتا نہیں میں کون ہوں"، پہلوان نے کہا"کون ہے تو مجھے بتا"۔ آدمی نے کہا"میں بیمار ہوں"۔

مرسلہ: وسیم الدین احمد...... لاہور

دانتوں کے ڈاکٹر نے اپنے نئے مریض سے ایک پرانے مریض کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"کم بخت نے چھ مہینے سے میرا دو ہزار کا بل ادا نہیں کیا۔ آج میں اس کے گھر جاؤں گا اور اپنے روپے وصول کروں گا۔"

دوسرے دن نیا مریض ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کے بازو پر سفید پٹی بندھی ہے اور وہ اپنا بازو پکڑ کر بیٹھے ہیں۔

"کیا ہوا؟ پرانے مریض سے بل وصول کرلیا آپ نے؟" نئے مریض نے پوچھا۔

"بل دینے کے بجائے اس کم بخت نے میرے ہی لگائے ہوئے دانتوں سے مجھے کاٹ لیا۔" ڈاکٹر صاحب نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

مرسلہ...... مولا بخش بلوچ، تربت بلوچستان

ایک آدمی بس میں داخل ہوا اور اونچی آواز میں لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "آج سے دس سال پہلے میں ایک بدنام ڈاکو تھا۔ ایک دن پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، پولیس میرے پیچھے تھی۔ میں بھاگتے بھاگتے پاکستانی سرحد پار کرکے بھارتی سرحد میں داخل ہوگیا۔ پولیس مجبوراً واپس لوٹ گئی۔ میں نے دیکھا کہ بھارتی سرحد کے اندر آم کے سیکڑوں پودے لگے ہیں اور پاکستانی سرحد کے اندر ایک بھی نہیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے بہت سے پودے اکھاڑ کر پاکستانی سرحد کے اندر لگا دیئے۔ آج وہ پودے درخت ہیں اور ان پر ماشاء اللہ ایک ایک کلو کا آم لگتا ہے۔ میں نے چوری ڈکیتی سے توبہ کرلی اور انہیں آموں سے تیار کردہ میٹھی گولیاں بیچتا ہوں۔ چار چار آنے، چار چار آنے۔"

مرسلہ...... عامر شہزاد اشرف، فیصل آباد

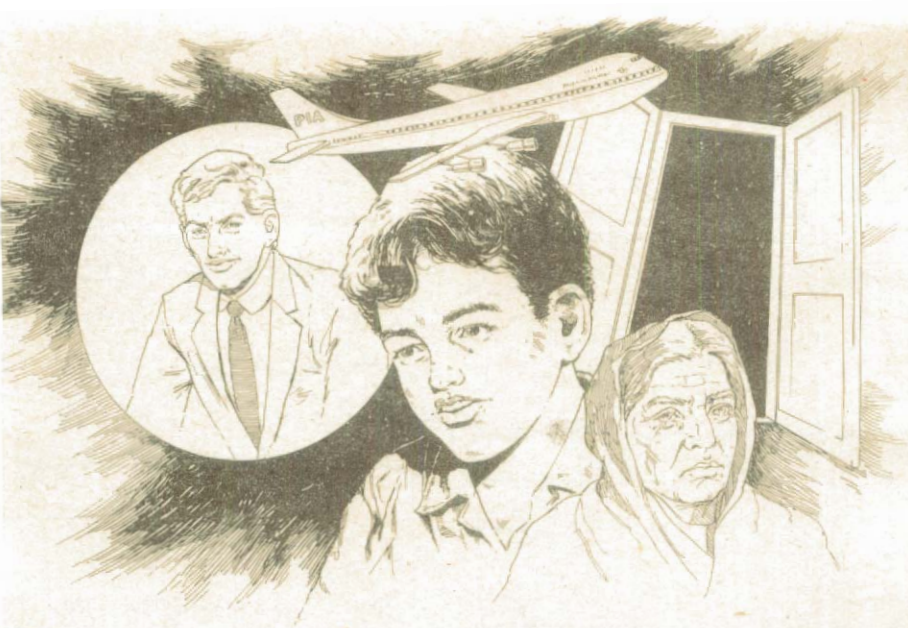

ابّو کی واپسی

نزہت کلیم

بچّوں کی اچھّی تربیت اور دیکھ بھال ماں باپ کی بنیادی ذمّہ داری ہے حکومت ہر طرح سے مدد کرے گی کہ ماں باپ یہ ذمّہ داری پوری کرسکیں ۔

اسکول کی چھُٹی ہو چکی تھی۔ بچّے اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ عدیل اپنا بستہ لئے، اسکول کے باہر کھڑا اپنی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہر بچّے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ بچّے ایسے تھے جو اپنے والد کے ساتھ گھر جا رہے تھے۔ جب بھی کوئی ایسا بچّہ نظر آتا، عدیل کی آنکھوں میں دُکھ کے سائے پھیل جاتے۔ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اپنے ابّو کی انگلی پکڑ کر گھر جائے۔ چاہے پیدل جائے یا موٹر سائیکل پر۔ اپنی بڑی سی کار میں تو بیٹھنے پر اس کا دل ہی نہیں راضی ہوتا تھا۔

ڈرائیور کار لاکر اس کے قریب روک دیتا اور دروازہ کھول دیتا۔ وہ خاموشی سے اس میں بیٹھ جاتا۔ گھر پہنچ کر بھی وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ عدیل کی امّی اسے بہت پیار کرتی تھیں لیکن عدیل کا جی چاہتا تھا کہ اس کے ابّو بھی اسی گھر میں رہیں۔ وہ ان سے کھیلے، ضد کرے، ان کے ساتھ سیر کرنے جائے۔ مگر ابّو تو کتنے برسوں سے ملک سے باہر

تھے۔ پتا نہیں ان کا کام کیسا تھا کہ تین سال میں صرف ایک بار آفس سے چھٹی ملتی تھی۔

پچھلی بار جب ابّو وطن آئے تھے تو وہ چار سال کا تھا اور جب وہ گئے تھے تو صرف سال بھر کا تھا۔ ابّو کے آنے پر ہی اسے یہ احساس ہوا کہ ان کی محبّت میں ایک انوکھا جذبہ تھا جو دادا جان یا چاچا کی محبت میں بھی نہیں تھا۔ وہ ابّو سے لپٹ لپٹ جاتا اور اس کے ابّو بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

جتنے دن ابّو گھر میں رہے، عدیل کا چہرہ کھلا کھلا رہا۔ وہ کھانا بھی اچھی طرح کھانے لگا، اسکول بھی خوشی خوشی جانے لگا لیکن چھٹی ختم ہونے سے ایک دن پہلے ابّو واپس چلے گئے اور وہ کسی نازک کھلونے کی طرح ٹوٹ گیا۔ اس نے تو اپنے ابّو کے ساتھ گھومنے پھرنے کے بہت سے منصوبے بنائے تھے۔

عدیل کی امّی، عدیل کے ابّو سے کئی بار کہہ چکی تھیں " دیکھئے اب آپ یہیں وطن میں ہم لوگوں کے پاس رہ کر کوئی اچھی ملازمت کرلیں یا کوئی کاروبار۔ " اور عدیل کے ابّو ہنس دیتے۔ "پگلی! تمھیں کیا معلوم یہاں کوئی ڈھنگ کی ملازمت بھلا مل سکتی ہے؟" ...... "مگر دیکھئے نا!" عدیل کی امّی پھر اصرار کرتیں "آپ پر آپ کے بیوی بچّوں کا حق ہے کہ نہیں؟ بچّے باپ کے بغیر کتنی کمی محسوس کرتے ہیں۔ آپ نے عدیل کا چہرہ دیکھا ہے؟ آپ کے آنے سے وہ کس قدر خوش رہنے لگا ہے لیکن جوں ہی آپ چلے جائیں گے، وہ بجھ کر رہ جائے گا۔ اپنے بچّے سے تو اس کا حق نہ چھینئے۔"

"اوہو...... تم نہیں سمجھو گی ان باتوں کو...... چائے پلاؤ"۔

ابّو کے جانے کے بعد عدیل پھر خاموش رہنے لگا۔ جب اسے ابّو بہت یاد آتے تو وہ دادا جان کے پاس چلا جاتا۔ دادا جان کی شکل ابّو جیسی تھی۔ یہ اس کا خیال تھا۔ اس لئے اسے دادا جان اچھے لگتے تھے۔ ایک بار اس نے امّی کو یہ بات بتائی کہ دادا جان کی شکل ابّو جیسی ہے تو امّی خوب ہنسیں اور بولیں۔ " پگلے! تمھارے ابّو کی شکل دادا جان جیسی ہے"۔

"مگر یہ تو ایک ہی بات ہوئی۔" عدیل حیران ہو کر بولا۔

"نہیں، بڑا فرق ہے، اچھا دیکھو دادا جان کی طبیعت بہت خراب ہے، تم بار بار جا کر انہیں تنگ نہ کیا کرو۔" امّی نے سمجھایا۔

دادا جان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ آخر ایک دن عدیل کے ابّو کو دادا جان کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع دے دی گئی۔ عدیل کے ابّو دوسرے ہی دن گھر پہنچ گئے۔ عدیل کو ابّو کے اس طرح اچانک آجانے کی خوشی تو بہت ہوئی لیکن ابّو اتنی جلدی سے آئے تھے کہ اس کے

لئے کوئی تحفہ بھی نہ لائے۔ پھر یہ کہ دادا جان کی بیماری کی وجہ سے ابّو رات دن دادا جان کے پلنگ کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے پاس عدیل کے لئے وقت نہ تھا۔ پھر بھی عدیل کو ابّو کا یوں اچانک آجانا بہت اچھا لگا۔ ابّو کے آنے کے بعد وہ اِترا اِترا کر چلنے لگا تھا۔

دادا جان کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ لیکن دادا جان دوسرے ہی دن اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ ابّو بہت اداس ہوگئے۔ بہت روئے۔ انہوں نے تین چار دن تو عدیل کو بالکل پیار نہیں کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ اس گھر میں عدیل بھی رہتا ہے۔

عدیل کا خیال تھا کہ اب ابّو واپس نہیں جائیں گے لیکن کچھ دنوں بعد ابّو نے سامان باندھنا شروع کر دیا اور آخر ایک دن وہ سب کو الوداع کہہ کر پھر ملک سے باہر چلے گئے۔ عدیل روزانہ دُعائیں مانگا کرتا کہ یا اللہ میاں ابّو نہ جائیں مگر ابّو چلے ہی گئے۔

ابّو کے جانے کے بعد عدیل پھر اداس رہنے لگا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ پھر کوئی ایسی بات ہو جائے کہ ابو جلدی سے گھر واپس آجائیں۔

آخر بہت سوچ کر اس نے ابّو کے نام اپنی ٹیڑھی میڑھی رائٹنگ میں پہلا خط لکھا۔ اس نے لکھا۔ "ابّو آپ بہت خراب ہیں۔ میرے سارے دوستوں کے ابّو ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں ان کو سیر کرانے لے جاتے ہیں مگر آپ میرے ساتھ نہیں رہتے۔ میں ہر روز آپ کی تصویر سے باتیں کرتا ہوں۔ اب مجھ کو تصویر نہیں اصلی والے ابّو چاہئیں۔"

خط لکھ کر وہ امّی کے پاس لے گیا اور بولا "امی، آپ ابّو کو خط بھیجیں تو میرا خط بھی اس میں رکھ دیں"۔

"ہائے میرے لال نے خط لکھا ہے!" امی خوش ہو کر بولیں۔ "دیکھوں تو کیا لکھا ہے"۔

خط پڑھ کر امّی فکر مند سی ہو گئیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگیں،

"بیٹا، ابّو آپ ہی کی خاطر باہر گئے ہیں۔ آپ کی اچھی تعلیم اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے وہ ہم سے دور ملازمت کر رہے ہیں"۔

"مگر نعیم، خالد اور جاوید کے ابّو تو یہیں پر ہیں"۔ عدیل نے حجت کی۔

"اچھا اچھا بہت باتیں بنانے لگے ہو"۔ امّی نے جھڑک دیا۔

دادی جان نے امّی کے ڈانٹنے کی آواز سن لی اور بولیں،

"بہو! بچّے کو جھڑکا نہ کرو۔ بچّے اگر پوچھتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ ان کو نرمی سے سمجھانا چاہئے۔ یہ بھی ان کا حق ہے"۔

امّی نے عدیل کا خط بھیج دیا مگر ابّو نہ آئے۔ ایک دن عدیل نماز پڑھ کر دعا مانگ رہا تھا تو اچانک

اسے خیال آیا کہ ویسے تو ابو کئی کئی سال نہیں آتے لیکن دادا جان کی طبیعت خراب ہوئی تو وہ فوراً پہنچ گئے۔ تو اگر دادی جان ...... توبہ توبہ ...... اس کا دل دھک سے رہ گیا وہ کتنی بُری بات سوچ رہا تھا۔ "اللہ میاں مجھے معاف کر دیجئے۔ دادی جان کو لمبی عمر دے دیجئے، مگر میں کیا کروں۔ میرے ابو کیسے واپس آئیں گے؟"

اس کے بعد کتنی ہی بار عدیل کو دادی جان کا خیال آیا، ہر بار اس کے دُعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھ گر جاتے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ نئے سرے سے دادی جان کی لمبی عمر کی دعائیں کرنے لگتا مگر اب بھی کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ دادی جان کی طبیعت خراب ہو جائے اور ابو دادی جان کو دیکھنے کے لئے آ جائیں۔

ایک دن عدیل بیٹھا اسکول کا ہوم ورک کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ نظریں اُٹھا کر دادی جان کو بھی دیکھ لیتا جو سروتے سے چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ عدیل نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ باہر تار والا کھڑا تھا۔ اس نے کہا، "بیٹا امی کو بلاؤ" ...... عدیل امی کو بلا لایا۔ امی نے تار وصول کیا۔ اندر آکر امی نے لفافہ کھول کر تار نکالا۔ تار پڑھتے ہی امی نے عدیل کو گلے لگا لیا اور رونے لگیں۔ عدیل حیران ہو کر کہے جا رہا تھا...... "کیا ہوا، امی، کیا ہوا؟"

امی نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے۔

معلومات

۱...... مینڈک کے دل کے پانچ خانے ہوتے ہیں۔
۲...... کوئل ایک ایسا پرندہ ہے جو گھونسلہ نہیں بناتا۔
۳...... مکڑی اپنے جال میں نہیں پھنستی اس لئے کہ اس کی ٹانگوں میں ایک خاص چکناہٹ ہوتی ہے۔
۴...... مچھر کے تقریباً ۲۲ دانت ہوتے ہیں۔
۵...... انسانی بال گرمیوں میں زیادہ بڑھتے ہیں۔

انھوں نے خوشی سے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "عدیل تمہارے ابو ہفتہ کو واپس آ رہے ہیں۔ مستقل طور پر یہاں رہنے کے لئے اب وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

"سچ؟ امی۔ سچ؟" عدیل خوشی سے چلایا۔ پھر وہ دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا، جہاں دادی جان بیٹھی سروتے سے چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ وہ دادی جان سے یہ کہتے ہوئے لپٹ گیا۔ "دادی جان، دادی جان، شکر ہے آپ کو کچھ نہیں ہوا۔ کچھ نہیں ہوا۔ ابو آرہے ہیں ہفتے کو آرہے ہیں۔ شکر ہے آپ کو کچھ نہیں ہوا۔"

دادی جان چند لمحے تک حیرانی سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر انھوں نے عدیل کو بڑی مشکل سے کھینچ کر الگ کیا۔ سچ کہہ تیرے ابو آرہے ہیں؟"

"ہاں دادی جان۔ شکر ہے آپ کو کچھ نہیں ہوا ......"

"چل ہٹ نگوڑے۔ مجھے کیا ہونا تھا۔ چل ہٹ مجھے شکرانے کی نماز پڑھنی ہے۔" ■

ریمانڈ ہوم کے قیدی بچّے

بچّوں کو ہر قسم کے تشدد ظالمانہ سلوک اور سخت سزاؤں سے محفوظ رکھا جائے گا۔

فتح محمد برفت ، ■ رعنا صبا

کوئی نہیں تیرا تو میری جان خدا ہے!

آج کے تمام جدید علوم اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے اکثر بچّے پیدائشی طور پر معصوم پاک و پوتر اور کم و بیش یکساں صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ سماجی حالات، سماجی تربیت اور خصوصاً والدین کا برتاؤ اور رویّہ ان میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ بچّے پڑھ لکھ کر کامیاب انسان بن جاتے ہیں جبکہ بعض بچّے حالات کی گردش کے چکر میں پھنس کر بے راہ رو اور مجرم بن جاتے ہیں۔

آج ہم آپ کو ایسے ہی بچّوں کی کہانی سنا رہے ہیں جو اپنی غلط حرکتوں کی وجہ سے قید کر دیئے گئے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ کراچی میں بچّوں کے لئے دو علیحدہ جیلیں ہیں۔ ایک بہت ہی چھوٹے بچّوں کے لئے جو ریمانڈ ہوم کہلاتی ہے۔ یہ ناظم آباد میں ہے اور یہاں اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچّوں کو قید کیا جاتا ہے۔ جو مجرم، ملزم یا لاوارث ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسری جیل

بورسٹل جیل کہلاتی ہے۔ یہ لانڈھی میں واقع ہے۔ بورسٹل جیل میں بڑی عمر کے ایسے بچّوں کو جو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں، قید کیا جاتا ہے۔ ہم آپ کو جن قیدی بچوں کی کہانی سنا رہے ہیں وہ کچھ عرصہ قبل مختلف جرائم یا الزامات میں ملوث ہونے کی بنا پر ریمانڈ ہوم ناظم آباد میں قید تھے۔ ہم نے ان سے انٹرویو کئے اور ریمانڈ ہوم کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے بھی ان کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ہم نے وہاں موجود چھتیس قیدی بچوں سے انٹرویو کئے لیکن آنکھ مچولی میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو صرف چار قیدی بچوں کی کہانی سنا رہے ہیں۔ بقیہ کی کہانیاں پھر کسی اور موقع پر سنائیں گے۔

ریمانڈ ہوم اس طرح کی کوئی بہت بڑی جیل نہیں ہے جیسی آپ نے بڑی عمر کے مجرموں کی جیلیں دیکھی ہوں گی۔ یہ چھوٹی سی جیل ہے جہاں بچّوں کو ان کی اصلاح کی غرض سے رکھا جاتا ہے لیکن ریمانڈ ہوم کی فضا میں بچّوں کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔

ریمانڈ ہوم کا عملہ ناخواندہ اور سخت گیر ہے۔ ان کا برتاؤ بچّوں کے ساتھ بہت اچھا نہیں ہے۔ عملے کے لوگ ان بچّوں کی نفسیات کو نہیں سمجھتے۔ حد تو یہ ہے کہ جو مولوی صاحب ان بچّوں کو پڑھانے آتے ہیں، وہ بھی ڈنڈے سے ان بچّوں کی پٹائی کرتے ہیں۔ اس قسم کے سلوک سے بچّوں میں لکھنے پڑھنے سے بیزاری ہی پیدا کی جاسکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ریمانڈ ہوم سے نکلنے والے بچّوں کے معاشرے کا مفید شہری بننے کی اُمید بہت کم ہے۔ یوں بھی ان بچّوں کا خاندانی پسِ منظر پہلے ہی تاریک ہوتا ہے۔ مثلاً شمیم کی کہانی لیجئے۔

پندرہ سالہ شمیم کبھی اسکول میں داخل نہیں ہوا۔ اس کے والدین میں علیحدگی ہو گئی تھی اور باپ نے دوسری شادی کر لی تھی اور شمیم کو بھی زبردستی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ سوتیلی ماں کا سلوک شمیم کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ وہ ہر وقت اس کو ڈانٹتی رہتی تھیں۔ معمولی باتوں پر اس کی سخت پٹائی ہوتی تھی، اس وجہ سے اس کی سوتیلی ماں اور باپ میں اکثر و بیشتر لڑائی جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔ والدین کو شمیم کی تعلیم و تربیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ عدم توجہ اور ماں باپ کی ان بن کی وجہ سے شمیم گھر کے ماحول سے بیزار ہو کر زیادہ تر گھر سے باہر رہنے لگا اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک ورکشاپ پر کام کرنے لگا جہاں اس کی دوستی اپنی عمر سے بڑی عمر کے لوگوں سے ہو گئی جو نشہ کے بھی عادی تھے۔ شمیم بھی ان کی صحبت میں رہ کر نشے کا عادی ہو گیا اور پھر وہ اپنے "بڑے دوستوں" کے کہنے پر منشیات بھی فروخت کرنے لگا۔ محلے کے لڑکے اسے دادا کہتے تھے اور وہ اپنے علاقے میں "منشیات فروش" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ پولیس کو بھی اس کے متعلق پتہ چل گیا۔ ایک دن منشیات

فروخت کرتے ہوئے پولیس نے اسے پکڑ لیا اس پر مقدمہ چلا اور اسے تین ماہ کی سزا ہو گئی جو وہ ریمانڈ ہوم ناظم آباد میں کاٹ رہا تھا۔ اس سے افسوس ناک بات کیا ہو گی کہ ماں باپ کی لاپروائی اور غلط برتاؤ کی وجہ سے شمیم گھر سے جیل پہنچ گیا۔

ایک اور قیدی بچّہ چودہ سالہ رستم تھا جو جیب تراشی کے الزام میں ریمانڈ ہوم میں قید تھا۔ رستم کے والدین غریب تھے، والد برف کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اس کے چھ بہن بھائی تھے۔ آمدنی کم اور بچّے زیادہ۔ زندگی کی ضرورتیں بڑی مشکل سے پوری ہوتی تھی۔ گھر میں ہر وقت جھگڑا رہتا۔ اور عموماً ماں اور باپ دونوں کے غصے اور ناراضگی کا نشانہ بچّے ہی بنتے۔ رستم کو پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر گھر کی معاشی بد حالی کی وجہ سے وہ اسکول میں داخل نہ ہو سکا۔ باپ نے اسے قالین بنانے کے کارخانے میں کام پر لگوا دیا اور جب اسے تنخواہ ملتی تو پوری کی پوری والد لے لیتے اور اسے کچھ نہیں دیتے اور اگر وہ پیسے مانگ لیتا تو اسے ڈانٹ کر گھر سے باہر نکال دیا جاتا۔ رستم صبح سویرے کام پر جاتا اور شام کو تھک ہار کر واپس آتا۔ گھر میں تفریح کا کوئی وسیلہ نہ تھا اور باہر تفریح کے لئے پیسے چاہئیں تھے۔ رستم زندگی کی یکسانیت سے اکتا جاتا، اس کے دوست گھومنے پھرنے جاتے اور واپس آکر اسے مزے مزے کے قصے سناتے، جس سے اس کے دل میں گھومنے پھرنے کی خواہش اور شدید ہو جاتی، ایک دن اس نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے والد سے پیسے مانگے۔ حسبِ دستور اسے ڈانٹ ڈپٹ ہی ملی۔ گھر سے مایوس ہو کر اس نے ایک شخص کی جیب کاٹنے کی کوشش کی، اس شخص نے اسے پکڑ لیا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ اب وہ اپنی تمام ادھوری خواہشوں کے ساتھ جیل میں زندگی گزار رہا تھا۔

چودہ سالہ نجم ایک ایسا بچّہ تھا جس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور والدہ نے دوسری شادی کر لی تھی، اس نے کبھی اسکول نہیں دیکھا۔ اس کے تین سوتیلے بہن بھائی تھے، گھر میں کام صرف اس سے لیا جاتا اور سختی بھی صرف اس کے ساتھ کی جاتی۔ سوتیلے باپ کا سلوک کافی ظالمانہ تھا جس کی وجہ سے اس کی ماں اور سوتیلے باپ میں لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے جس سے گھر کا ماحول اور کشیدہ ہو جاتا۔ وہ گھر کے ماحول سے تنگ ہو کر باہر نکل جاتا۔ جہاں آوارہ لڑکوں سے اس کی دوستی ہو گئی، جن کی صحبت میں رہ کر وہ عادی چور بن گیا۔ شروع شروع میں وہ سائیکلیں چرایا کرتے تھے اور پھر موٹر سائیکلیں اور کاریں چوری کرنے لگے۔ چوری کی گاڑیاں چلانے میں نجم کو بہت مزہ آتا تھا۔ ایک دن وہ ایک کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کار کے مالک نے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا، اس پر کار چوری کرنے کا مقدمہ چلا اور اسے چھ ماہ کی قید ہو گئی۔ جو وہ ریمانڈ ہوم میں بھگت رہا تھا۔

آٹھ سالہ آصف ایک یتیم بچہ تھا، وہ

ماں باپ کے پیار و محبت اور شفقت سے بالکل نا آشنا تھا، ماں باپ کے مرنے کے بعد اسے اور اس کے پانچ بہن بھائیوں کو نانی نے پالا تھا۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ نانا نانی بھی غریب تھے لہٰذا وہ بچوں کو تعلیم نہ دلا سکے۔ آصف سارا دن گھر کے باہر کھیلتا رہتا۔ ان کا گھر ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا وہ سارا دن ٹرین کو آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی ٹرین میں سفر کرے کیونکہ ٹرین میں بیٹھے ہوئے لوگ اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے دوست کے ساتھ اسٹیشن کی طرف چل پڑا اور ٹرین پر بیٹھ گیا۔ اس طرح کراچی پہنچ گیا۔ کراچی اس کے لئے ایک اجنبی شہر تھا وہ اور اس کا دوست کئی دن سڑکوں پر گھومتے رہے ایک دن اس کا دوست بھی اس سے بچھڑ گیا۔ وہ اسے تلاش کرتا رہا مگر وہ اسے نہ مل سکا۔ ایک دن پولیس نے اسے آوارہ گردی کے الزام میں پکڑ لیا اور لاوارث قرار دے کر ریمانڈ ہوم بھیج دیا جہاں وہ اپنے نانا نانی اور بہن بھائیوں کو یاد کر کے روتا رہتا ہے۔ اسے اپنا ٹوٹا پھوٹا گھر بہت یاد آتا ہے۔

ریمانڈ ہوم کی دنیا بہت ہی عجیب و غریب ہے۔ اگر آپ ایک حساس دل کے مالک ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہاں آکر چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس حالت میں دیکھ کر آپ افسردہ نہ ہو جائیں اور آپ کا دل نہ بھر آئے۔ ■

محنت کا پسینہ ہے

دنیا کے مختلف ممالک میں بے شمار بچے ایسے ہیں جو محنت مزدوری کرتے ہیں اور اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتے ہیں ان ننھے پھولوں کو زندگی کے ابتدائی سالوں میں ہی کاموں پر لگا دیا جاتا ہے جب ان کی عمر پڑھنے کی ہوتی ہے۔ دنیا کے مختلف ادارے بچوں کی جبری محنت کے خلاف اقدامات کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ترقی پذیر ملکوں میں بچوں سے سخت کام کروائے جاتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۰ء میں پوری دنیا کے تقریباً بارہ فیصد بچوں سے محنت طلب کام لئے جا رہے تھے۔ ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

ملک	محنت کش بچوں کا تناسب
بھوٹان	۴۲٪
روانڈا	۴۲٪
نیپال	۴۰٪
مالاگاسی	۳۷٪
آئیوری کوسٹ	۳۴٪
مالی	۴۲٪
اپر وولٹا	۴۱٪
وسطی افریقہ	۳۷٪
بوٹسوانا	۳۴٪
برونڈی	۳۲٪

مرسلہ: محمد نعمان اصغر، فیصل آباد

یتیم بچہ

مستانہ جوگی

ہے رات کی خموشی، سنسان کُل جہاں ہے
تارے چمک رہے ہیں، مہتاب ضوفشاں ہے

ننھا سا ایک بچہ، بیٹھا ہوا سڑک پر
تکتا ہے آسماں کو، چہرے سے غم عیاں ہے

رو رو کے کہہ رہا ہے، کیا لطف زندگی کا
دنیا میں ہیں بہاریں، میرے لئے خزاں ہے

میں نے کبھی نہ دیکھے ماں باپ زندگی میں
میرے لئے تو ہائے سنسان یہ جہاں ہے

ماں باپ آج ہوتے، سو ناز وہ اٹھاتے
وہ عیش زندگی کا اب وہم اور گماں ہے

اتنے بڑے جہاں میں میرا نہیں ہے کوئی
کون و مکاں کے مالک یہ کیسا امتحاں ہے

ہوتی جو میری امّی، میری بلائیں لیتی
اب میرا اس جہاں میں ہمدم نہ پاسباں ہے

مجھ پر حرام ہے اب آرام زندگی کا
ماں باپ جب نہیں تو بے کار یہ جہاں ہے

سردی ہے کس غضب کی، تن پر نہیں ہے کپڑا
پُرسانِ حال میرا کوئی نہیں یہاں ہے

افسانہ زندگی کا جا کر کسے سناؤں
میرے لبوں پہ تالے، خاموش یہ زباں ہے

سب لوگ سو رہے ہیں، میں آہیں بھر رہا ہوں
میرا تو اس جہاں میں در ہے نہ آستاں ہے

اب کون مجھ کو اپنا لختِ جگر کہے گا؟
دنیا میں کوئی میرا مونس نہ مہرباں ہے

قسمت کو رو رہا ہوں، فریاد کر رہا ہوں
لب پر ہیں میرے نالے، دل میں غم نہاں ہے

یارب ترے کرم کی ہے آس میرے دل میں
میرے لئے تو ورنہ ویران سا جہاں ہے

نتائج کا اعلان

گن کے بتاؤ پاؤ انعام ..... کتنے چہرے کتنے نام

دسمبر ۹۲ کے شمارے میں اس عنوان سے چہرے اور انکے نام بوجھنے کا ایک تصویری مقابلہ چھاپا تھا اس مقابلے میں ہمیں سینکڑوں تعداد میں جوابات موصول ہوئے۔ بہت سے ساتھیوں نے چہروں کی تعداد تو درست لکھی لیکن مطلوبہ چہروں کے نام لکھنے میں ناکام رہے حالاں کہ مقابلے کے شعر میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ چہروں کی تعداد کے ساتھ ان کے نام بھی لکھنا ہیں۔

چہروں کے اس تصویری مقابلے میں کل چہروں کی تعداد چھبیس (۲۶) تھی جن میں سے دو چہرے (ریڈ انڈین) انسانوں کے تھے۔

دسمبر ۹۲ کے تصویری مقابلے کے دُرست جوابات

(۱) زیبرا	(۵) گدھا	(۹) بھالو	(۱۳) لومڑی	(۱۷) کچھوا	(۲۱) الّو	(۲۵) ریڈ انڈین
(۲) گائے	(۶) خچر	(۱۰) ببر شیر	(۱۴) چیتا	(۱۸) سانپ	(۲۲) بطخ	(۲۶) ریڈ انڈین
(۳) گھوڑا	(۷) ہاتھی	(۱۱) بھیڑیا	(۱۵) کتا	(۱۹) مکڑی	(۲۳) مینڈک	
(۴) ریچھ	(۸) مگرمچھ	(۱۲) بن مانس	(۱۶) بلی	(۲۰) طوطا	(۲۴) بھیڑیا	

دُرست جوابات پر انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب

(۱) رضوان احمد خان، مارٹن کوارٹر، جہانگیر روڈ، کراچی۔

(۲) شبنم نورین، لیاقت آباد، کراچی۔

(۳) آصف وقار آصف، واہ کینٹ، لاہور

(۴) ناصر حسن، تین ہٹی، کراچی۔

مقابلے میں حصّہ لینے والے ساتھیوں کے نام

انوار احمد نومی، اسلام آباد، فہد عمران، کراچی۔ سہیل عباس، ساہیوال۔ صبا اعجاز، اسلام آباد۔ محمد صفدر خواجہ، ملتان۔ سید حیدر علی ہمدانی، خوشاب۔ عبدالرزاق، ملتان۔ گل محمد، ملتان۔ رباب حسن، لاہور۔ عمران بشیو لانڈھی، کراچی۔ راؤ محمد شاہد اقبال بہادر، نواب شاہ۔ محمد رفیق دانش، حیدر آباد۔ صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی۔ زاہد حسین تھیبو، میر پور خاص۔ اعجاز احمد، ملتان۔ مریم خالد ملتانی، اسلام آباد۔ فیصل مختار، ملتان۔ سید واجد حسین شاہ، روہڑی۔ محمد علی شکیل احمد قادری، ٹنڈو آدم۔ نواب علی پریمی، سانگھڑ۔ مغیث محمود بٹ، فیصل آباد۔ نثار احمد ہاشمی، کراچی۔ عظمیٰ نورین، اوکاڑہ۔ فوزیہ صابر حسین شیخ، حیدر آباد۔ ثقلین حسن شہریار، جھنگ صدر۔ محمد عامل خان، سکھر۔ شبیر احمد کنول، مونگ گجرات۔ شیر محمد پنہور، میر پور خاص۔ سید امیر امام نقوی، کراچی۔ اسماعلی، دمام، سعودی عرب۔ خالدہ جبیں اعوان، کراچی۔ عبدالحفیظ شاہد، مخدوم پور پہوڑاں۔ زرتاشیہ یوسف، لانڈھی کراچی۔ نعمان، حالی روڈ کراچی۔ محمد زاہد اکرم، رحیم یار خان۔ زاہدہ رحمت، ساہیوال۔ محمد اعظم، کراچی۔ ذیشان بن ایوب منظر، لاہور۔ محمد عابد، سانگھڑ۔ خالد جاوید، دیپا پور سٹی اوکاڑہ۔

شاہینہ اسلام (؟) امر جلیل، فاروق عدیل، خیرپور میرس۔ شکیل۔ کراچی جنرل اسٹور، سکھر۔ رفعت مختار، منڈی مرید کے۔ کوکب خان، کراچی۔ سیّدہ بینا اشرف، سیّد شارق علی۔ جمشید کوارٹرز، کراچی۔ آمنہ نروائی، دالبندین۔ طیب رضا، جہلم۔ جعفر (؟) عبدالساجد، حیدر آباد۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ فلذہ فرحین، کراچی۔ جواد سمیع، کراچی۔ محمد ارشاد، کراچی۔ عمّار حیدر، دیپال پور۔ عمران صدیق، لالہ موسیٰ۔ علی رضا اسلام آباد، لاہور۔ ایم سلیم رضا، لاہور۔ محمد اعجاز پرنس، راولپنڈی۔ سیّد محمد طلحہ، سیّد محمد اسامہ۔ گڑیا۔ شیماں، گڈی، سنبل مظفر، سندس مظفر، صدف مظفر، راولپنڈی۔ ابنِ رضا، لاہور۔ اطہر اقبال، جاوید اقبال، کراچی۔ مولا بخش، آصف خان، بنارس۔

جیولری بکس حاصل کرنیوالے سَو خوش نصیب

فائزہ ایوب، گوجرانوالہ۔ طلال ناصر انصاری، لاڑکانہ۔ فاطمہ احسن علوی، ملتان۔ حنا سعید، کراچی۔ جواد احمد، کراچی۔ سلمیٰ ضیاء، اسلام آباد۔ زبیر ظہور احمد خان، حیدرآباد۔ افشاں حمید، سکھر۔ احمد رضا، کراچی۔ صفیہ شمیم، حیدرآباد۔ امان اللہ خان افغانی، سرگودھا۔ صحیفہ جلیل نقوی، لاہور۔ عائشہ انوار، لاہور۔ محمد سرور، ہارون آباد۔ صائمہ نورین، کوئٹہ۔ حمیرا شاہین، پشاور۔ عمیر شبیر، لاہور۔ ثناء، کراچی۔ نازیہ خانم، سرگودھا۔ زہرا رشید، ساہیوال۔ صبا صدیقی، کوئٹہ۔ ارم خان، ملتان۔ ثمرین ناز، کراچی۔ نوید فاروق، کھاریاں کینٹ۔ رضوانہ گل، رسالپور۔ مصباح، کراچی۔ ناظمہ حسین طاہر، لاہور۔ نادیہ رؤف، لاہور۔ علی ایزد عباس، لاہور، شفق جبیں، ملتان۔ صائمہ گل، کراچی۔ شازیہ لطیف، لاہور۔ کلیم اللہ، حیدرآباد۔ اطہر ثاقب، ڈیرہ غازی خان۔ نادیہ نثار، مردان۔ عابدہ محمود، حیدرآباد۔ فیصل عمران ڈوگر، کمالیہ۔ احمد اکاش، رحیم یارخان۔ شاہدہ بالو، بارکھان۔ امجد محمود، میرپور آزاد کشمیر۔ کنور جمشید یوسف، خٹک۔ راحیل رعنا پاشا، سبی۔ صائمہ بشیر، بہاولپور۔ مہوش عرفان، کوئٹہ۔ کمال احمد، کراچی۔ جعفر علی، کراچی۔ مہوش مطلوب، لاہور۔ عرفانہ منشاء، ملتان۔ جویریہ سنبل، کراچی۔ صائمہ اختر، کراچی۔ سلمان شفیع، لاہور۔ سعدیہ اکرم، خانیوال۔ سعدیہ جہاں، کراچی۔ عدنان واحد، کراچی۔ کوثر پروین، ملتان۔ نبیل علی، جہلم۔ زبیر کامران، لاہور۔ ملکہ صنوبر، مظفرگڑھ۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ انیتا طارق، کراچی۔ احمد اقبال، بہاولپور۔ رابعہ حکیم، لاہور۔ رحمت علی قریشی، سوات۔ النوشاہ مجاہد، لاہور۔ فرخندہ خالد، لاہور۔ سیما، حیدرآباد۔ جویریا احمد، کراچی۔ صدف جبار، کراچی۔ فرح مشتاق، حیدرآباد۔ ایم محفوظ راجپوت، دادو۔ نمرہ علیم، کوہاٹ۔ شائستہ مراد علی، اسلام آباد۔ فوزیا احسان، نوشہرہ۔ فرزانہ رفیع، لاہور۔ حنا گل، کراچی۔ سائرہ فدا، جہلم۔ صائمہ زہرہ، حیدرآباد۔ عنبرین جاوید، لاہور۔ غزالہ فرحت، کراچی۔ اسما نصیر، اسلام آباد۔ نازیہ سلطان، کراچی۔ مرتضیٰ عارف، لاہور۔ غفرانہ سندس، لاہور۔ وقار احمد، کراچی۔ ملک عامر نیاز اعوان، کراچی۔ نیلم بشریٰ، سرگودھا۔ خدیجہ شمیم، کراچی۔ ارم حفیظ، ملتان۔ ارمغان خان، پشاور۔ عروج اقبال، کراچی۔ فرحت سعید، کراچی۔ محمد معظم، گوجرانوالہ۔ صائمہ کلیم، کراچی۔ افشین، نواب شاہ۔ صائمہ علی چوہدری، راولپنڈی۔ تسنیم طاہر علی، کراچی۔ عفت النساء، کراچی۔ عمر سرفراز، گلگت۔ زہرہ اسحاق، کوئٹہ۔ ناہید، کراچی۔

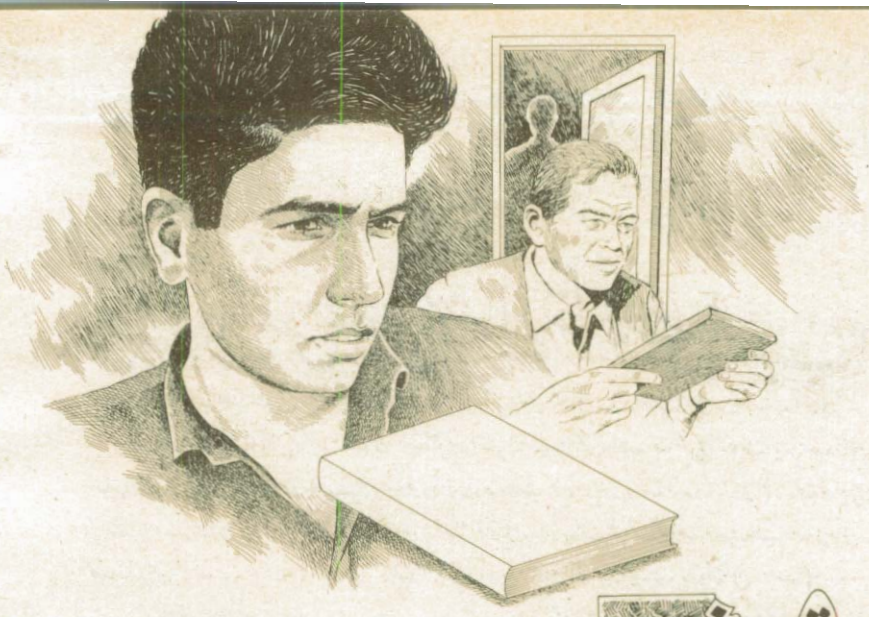

تم بچے نہیں رہے

محمد ارشد سلیم

اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکے لڑکیوں کو بچہ مانا جائے گا

"نعمان! ...... نعمان!! یہاں آؤ میرے پاس ......" غفران صاحب بہت غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔ منیبہ اور کاشان نے ڈیڈی سے شکایت کی تھی کہ نعمان بھائی نے انہیں پھر مارا ہے۔

"جی ڈیڈی! ...... آپ نے مجھے یاد فرمایا......" نعمان نے ڈرتے ڈرتے ادب سے کہا۔

"تم نے منّی اور کاشی کو آج پھر مارا ہے؟ میں نے تم کو وارننگ بھی دی تھی کہ آئندہ تم اپنی چھوٹی بہن اور بھائی سے نہیں لڑائی کرو گے۔" غفران صاحب نعمان کے قریب آتے ہوئے دھاڑے۔

"جج۔ جج ...... جی ...... منّی اور کاشی مجھے کیرم کھیلنے میں شامل نہیں کر رہے تھے۔" نعمان نے مارے خوف کے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں کر رہے تھے شامل تو نہ کھیلتے ان کے ساتھ ......! اور ویسے بھی اب تم بچے نہیں رہے۔" غفران صاحب نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اس بار اسے معاف کر دیں آئندہ منّی اور کاشی سے نہیں لڑے گا ...... میرا نعمان تو ماشاء

اللہ اب بڑا ہو گیا ہے۔۔" نعمان کی امیّ نے اندر آتے ہوئے نعمان کو تھپکتے ہوئے کہا اور غفران صاحب غصّے پر قابو پاتے ہوئے بغیر کوئی جواب دیئے اپنے بیڈ روم کی طرف چلے گئے۔

نعمان کی عمر سولہ برس ہونے کو آئی تھی اور بقول اس کے ڈیڈی کے "اب وہ بچّہ نہیں رہا تھا" لہٰذا اب اسے بچّوں کے ساتھ کھیلنا اور لڑنا جھگڑنا نہیں چاہئے اور نہ بچّوں کی طرح ہر چیز کے متعلق پوچھنا چاہئے اور نہ زیادہ باتیں کرنی چاہئیں۔

نعمان اپنے آپ پر لاکھ قابو پانے کی کوشش کرتا لیکن پھر منیبہ اور کاشان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو جاتا۔ کھیل ہی کھیل میں بچّے لڑ پڑتے ہیں ...... بالکل اسی طرح نعمان کو بھی کھیل کے دوران کسی بات پر غصّہ آجاتا اور وہ منیبہ اور کاشان سے لڑ پڑتا ...... بعض اوقات انجانی بات کے لئے ڈیڈی کی طرف رُخ کر کے بچّوں کی طرح کوئی نہ کوئی سوال پوچھ بیٹھتا اور جواب میں ڈانٹ کے ساتھ "تمہیں اتنا بھی نہیں پتا کہ اب تم بچّے نہیں رہے" کا جملہ سننا پڑتا اور یہی جملہ نعمان کے اندر ایک طوفان ...... نہ تھمنے والا طوفان برپا کر دیتا......

وہ بیٹھا سوچتا رہتا...... اور جب کسی نتیجے پر نہ پہنچتا تو آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو جاتا، یوں دل کا غبار کچھ ہلکا ہو جاتا اور تو اور اسے تو کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے میں بھی یہی طعنہ سننا پڑتا تھا۔ کل ہی کی تو بات ہے جب وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا پڑھ رہا تھا تو ڈیڈی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "نعمان! ...... تم یہ کیسے بچّوں کی طرح پاؤں پھیلائے بیٹھے پڑھ رہے ہو...... اور اس جملے نے گویا اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا دیئے۔

نعمان اب بہت چُپ چُپ رہنے لگا تھا...... اس کی شوخی اور پیاری پیاری اداؤں کی جگہ چڑچڑے پن اور توڑ پھوڑ نے لینا شروع کر دی...... نعمان جو بلا کا ذہین تھا اب احساس کمتری کا شکار ہوتا جا رہا تھا...... پتا نہیں غفران صاحب یہ سب کچھ محسوس کر رہے تھے یا نہیں؟...... اگر محسوس کر رہے تھے تو پھر نظر انداز کر رہے تھے۔

اسی شام نعمان کو بک شاپ پر "بچّوں کے حقوق" کے عنوان سے ایک کتاب نظر آگئی۔ اس نے کتاب کو اِدھر اُدھر الٹ پلٹ کر دیکھا تو کتاب اسے معلوماتی لگی چنانچہ اس نے کتاب خرید لی۔ گھر آ کر اس نے کتاب ڈرائنگ روم کی میز پر رکھ دی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے دوست خالد نے اپنے نوٹس دینے کے لئے اسے بلایا تھا۔ خالد اس کے پڑوس ہی میں رہتا تھا۔ نعمان فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ غفران صاحب ڈرائنگ روم میں آئے تو انہیں میز پر کتاب رکھی نظر آئی۔ انہوں نے کتاب اٹھائی اور ورق گردانی کرنے لگے پھر انہیں کتاب میں کچھ دلچسپی محسوس ہوئی انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ مصنف نے لکھا

تھا۔ "بچوں کے حقوق کا معاہدہ ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے منظور کیا تھا۔ اس بین الاقوامی معاہدے کی خاص باتیں لکھنے کے ساتھ ان کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ مثلاً معاہدہ کی پہلی شق یہ ہے کہ اٹھارہ برس سے کم عمر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو بچّہ مانا جائے گا۔" غفران صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا۔ آگے لکھا تھا "بچّے عموماً پندرہ سولہ برس کی عمر میں جوانی کی حدود میں قدم رکھ لیتے ہیں چونکہ وہ پندرہ، سولہ برس تک بچپن کا زمانہ گزار چکے ہوتے ہیں اس لئے جوانی کی حدود میں قدم رکھنے کے باوجود وہ بچّوں کی سی حرکتیں کرتے رہتے ہیں کیونکہ اتنی جلدی وہ اپنی عادات و اطوار میں تبدیلی نہیں لاسکتے، لیکن بعض بڑے یہ سب کچھ سمجھ نہیں پاتے یا پھر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ان کو یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کے اس اقدام کا کیا نتیجہ نکلے گا یہی وجہ ہے کہ کچھ بچے کند ذہن ہو جاتے ہیں یا پھر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ احساس ان کی شخصیت کو دبائے رکھتا ہے۔" دروازے پر آہٹ ہوئی۔ غفران صاحب نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ نعمان کھڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے نعمان کے قریب پہنچے۔ اس کے شانوں پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور کہا "آئی ایم سوری نعمان! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ابھی اتنے بڑے نہیں ہوئے۔" یہ کہہ کر غفران صاحب نے جھک کر اپنے بیٹے کا ماتھا چوم لیا۔ ■

آزادی ان بچوں کا حق ہے

فلسطین جہاں کے عوام گزشتہ کئی برسوں سے اسرائیل کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور جہاں اب تک ہزاروں فلسطینی شہید ہو چکے ہیں لیکن ان کا جذبہ اب تک ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ اب تو ننھے فلسطینی مجاہد بھی آزادی کی اس جنگ میں شریک ہیں۔ اس کی بہترین مثال حسام حمّاد اور محمود ہیں جو اسرائیلی فوجیوں پر پتھر پھینکتے ہوئے ان کی گولیوں کا شکار ہوئے۔ ان کی عمر دس برس سے بھی کم ہے۔ حسام جو کہ ہسپتال کے ایک بستر پر خون میں لت پت پڑا تھا اس نے بتایا کہ "میرا باپ گزشتہ سات برس سے جیل میں قید ہے اور میرا ایک بھائی بھی گولی لگنے سے معذور ہو چکا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اسرائیلی فوجیوں کی نگاہ میں آ چکا ہوں اور وہ مجھے گولی مار دیں گے لیکن اس کے باوجود میں وہاں سے نہیں ہٹا۔" نوجوانوں کے بعد اب ننھے بچّے بھی میدانِ جنگ میں کود پڑے ہیں۔ جنوری ۱۹۹۳ء میں ۱۶ برس سے بھی کم پانچ بچّوں نے شہادت پائی اور سینکڑوں زخمی و معذور ہوئے۔ ۱۰ سالہ حمّاد بھی اس جنگ میں شریک ہے اس کے گھٹنے پر بھی گولی لگی ہے جس کو کھاتے ہوئے وہ بولا "میں واپس میدان میں آؤں گا۔" ہمت و شجاعت کے پیکر یہ بچّے اپنی سرزمین کے حصول کے لئے مرمٹنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ ننھے سپوت اسرائیلی مظالم کے آگے ڈھال ہیں۔ اگرچہ اسرائیلی فوجی ان بچّوں پر بے پناہ تشدد کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی یہ ننھے فلسطینی مجاہد ڈٹے ہوئے ہیں اور انشاء اللہ ان ہی کے لہو سے آزادی فلسطین حاصل ہوگی۔

(مرسلہ: محمد نعمان اصغر۔ فیصل آباد)

سربراہانِ مملکت کے فیصلے

(دنیا بھر کے بچوں کے بارے میں)

کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ہر سال دو کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر صرف سگریٹ بیچنے کے لئے اشتہارات پر خرچ کر دیئے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں اقوامِ متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں بچوں کے لئے ہونے والی عالمی سربراہ کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ اتنی ہی رقم اگلے دس برسوں میں بچوں کی جانیں بچانے پر خرچ کی جائے گی۔ کیونکہ اندازہ ہے کہ اگلے دس برسوں میں ۵ کروڑ بچے مختلف بیماریوں کی وجہ سے مر جائیں گے۔

بچوں کے لئے یہ عالمی سربراہ کانفرنس پاکستان، کینیڈا، مصر، مالی، میکسیکو اور سویڈن کی اپیل پر ۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۹۰ء کو نیو یارک میں منعقد ہوئی تھی، جس میں دنیا کے ۷۱ ممالک نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اگلی صدی شروع ہونے سے قبل بچوں کے لئے صحت، تعلیم اور سماجی بہبود کے شعبوں میں بہت سی سہولتیں مہیا کی جائیں اور بیماریوں، غذائی کمی، غربت، ظلم اور نا مناسب دیکھ بھال جیسے غیر معمولی مسائل حل کئے جائیں۔

ایک عالمی جائزے کے مطابق تقریباً آٹھ ہزار بچے قابلِ علاج بیماریوں کی وجہ سے مر جاتے ہیں جب کہ اسہال کی وجہ سے سات ہزار اور نمونیہ کی وجہ سے چھ ہزار بچے روزانہ مر جاتے ہیں۔ کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ ان بچوں کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

کانفرنس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ بچوں کے لئے بہتر سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں اگلے دس برسوں میں درج ذیل اقدامات کئے جائیں گے۔

○ ...... پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات میں ۳۰ فیصد کمی کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

○ ...... ایسے بچے جنہیں غذا نہ مل رہی ہو یا کم مل رہی ہو ان کی تعداد پچاس فیصد کم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

○ ...... تمام پاکستانی بچوں کو پینے کا صاف پانی فراہم کیا جائے گا اور گندے پانی کی نکاسی کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ بچوں تک پہنچانے کے لئے قدم اٹھایا جائے گا۔

○ ...... تمام پاکستانی بچوں تک تعلیم کی بنیادی سہولت پہنچائی جائے گی اور اس امر کو یقینی بنایا جائے گا کہ کم از کم ۸۰ فیصد بچے پرائمری تعلیم مکمل کر سکیں۔

○ ...... ایسے بالغ افراد جو، اَن پڑھ ہوں ان کی تعداد میں پچاس فیصد کمی کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے علاوہ خواتین کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی جائے گی۔

○ ...... مشکل حالات میں گھرے ہوئے بچوں کو بہتر تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

بہ خدمت جناب

منظور سومرو، کشمور۔ آپ کے رسالے میں اچھی اچھی کہانیاں اور دلچسپ معلومات ہوتی ہیں۔ مگر کم از کم ایک صفحہ معلومات عامہ کا دیا کیجئے۔ **والدہ عظیم حفیظ، اسلام آباد۔** آپ کا ارسال کردہ اسکول بیگ میرے یتیم بچے عظیم حفیظ کو موصول ہو گیا ہے۔ وہ یہ خوبصورت بیگ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور آپ سب کو دعائیں دینے لگا۔ میری بھی یہی دعا ہے کہ آپ ہمیشہ یتیم و غریب بچوں کی اسی طرح خدمت کر کے دعا لیتے رہیں۔ **اُسامہ آصف حسن کراچی۔** آپ "حقوقِ اطفال نمبر" کے بعد اب "شرارت نمبر" نکالیے۔ اس نمبر کے لئے آپ تمام اچھے ادیبوں سے ان کے بچپن کی یادگار شرارتیں حاصل کیجئے۔ اور ہو سکے تو چند مشہور فنکاروں اور دیگر شعبہ زندگی کے ممتاز افراد سے شرارتیں لکھوائیے اور ہمیں پڑھوائیے۔ ○ ..... تجویز بہت شاندار ہے۔ **شاہدہ جونیجو، رتوڈیرو۔** انکل ہم نے جنوری کا شمارہ نہیں خریدا کیا ہم آپ سے منگوا سکتے ہیں؟ ○ ..... کیوں نہیں۔ **مرزا عاطف مغل، بیلہ لسبیلہ۔** انکل آپ آنکھ مچولی میں آرٹ گیلری کا سلسلہ شروع کیوں نہیں کرتے۔ آنکھ مچولی کا ایک صفحہ اس پر بھی صرف کر دیں۔ **فرخ رشید خان، لاہور۔** اس بار ہم آپ کو جیولری بکس کا ایک کوپن ارسال کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اس مرتبہ ضرور ہمارا نام انعامات میں شامل

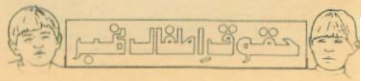

جناب مدیر اعزازی

السلام علیکم!

ایک خط ایک مسئلہ

میں قارئین کی توجہ ایک اہم اور خطرناک مسئلے کی طرف دلانا چاہتی ہوں۔ یہ مسئلہ آلودگی کا ہے۔ آلودگی کا مسئلہ تیسری دنیا کے لئے نہایت تشویش ناک ہے۔ جگہ جگہ غلاظت کا ڈھیر، دھواں اور شور۔ گاڑیوں کا شور تو اس قدر بڑھ چکا ہے کہ چند سالوں میں شاید پاکستان کے شہروں میں رہنے والے پچاس فیصد لوگ بہرے ہو جائیں اور دھواں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ لگتا ہے آنے والی نئی نسل کی رگوں میں خون کے بجائے دھواں دوڑ رہا ہو گا۔ ان کا ذمہ دار کون ہے۔ یقیناً اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ آئس کریم کھا کر کپ اور چمچہ گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ اسی طرح گھر کی صفائی کرنے کے بعد جو کچرا ہوا اسے گلی میں پھینک دیا جس میں مکھیاں اور مچھر پرورش پانے لگے اور یہی مکھیاں اور مچھر اڑ کر کھانے کی چیزوں پر بیٹھے جن کو کھانے سے ہم بیمار ہو گئے۔ اگر ہم نے اس بڑھتی ہوئی گندگی کو نہ روکا تو یہی گندگی زہر بن کر ہمارے جسموں میں اُتر جائے گی۔ فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں اوزون کی سطح کو چیر پھاڑ رہا ہے اور سورج کی مہلک شعاعیں زمین تک پہنچ رہی ہیں جس سے زمین کے درجۂ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور جب یہ تابکار دھواں بادلوں میں پہنچتا ہے اور ان بادلوں سے جو بارش ہوتی ہے وہ خالص ہونے کے بجائے آلودہ ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں پودے مر رہے ہیں۔ درختوں میں خطرناک کیڑے لگ رہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو رہی ہیں۔ آخر اس کا حل کیا ہے؟ ہم کب تک چُپ رہیں گے؟ گلیوں بازاروں سڑکوں حتیٰ کے اسکولوں اور پارکوں میں بھی جگہ جگہ کاغذ اور تھیلیاں نظر آتی ہیں۔" ہمیں صرف اور صرف اپنے عیش و آرام سے مطلب ہے' آگے کیا ہوتا ہے ہمیں کیا۔" یہ جملہ ہر کسی کی زبان پر ہے۔ اگر یہ جملہ یوں ہی سب کی زبان پر رہا اور اگر سب نے یہی وطیرہ اختیار کیا تو مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کے تیسری دنیا کا مستقبل دھوئیں کی طرح کالا اور تاریک ہو گا۔

(سیدہ آمنہ عاصم. کوئٹہ)

کریں گے۔ **محمد افضل رانا، لاہور۔** آپ آنکھ مچولی پر پوری توجہ دیں اور اس کے معیار کو پہلے جیسا بہتر کرنے کی کوشش کریں اور اس کی تعریف سُن کر سست نہ ہوں۔ نقل شدہ کہانیوں پر نظر رکھیں۔ **جمیلہ مہوش، حیدر آباد۔** میرے ابّو ہر ماہ آنکھ مچولی لاتے ہیں۔ میرے بھائی جان محمد طارق چار پانچ دن تک رسالہ پڑھتے ہیں پھر مجھے دیتے ہیں آپ سے گزارش ہے کہ بھائی جان کو کہیں کہ وہ رسالہ مجھے پہلے پڑھنے دیں، شکریہ۔ ○ ..... بھئی طارق میاں! چھوٹی بہن کا خیال کر لیا کریں۔ ٹھیک ہے نا۔ **قیصر محمود، سیالکوٹ۔** میری تجویز ہے کہ اگلی مرتبہ "اسلام نمبر" شائع کریں۔ **حافظ محمد ارشد حبیب، ملتان چھاؤنی۔** آپ سے ہمیں ایک شکایت ہے کہ آپ نے ہمارے خط کو آنکھ مچولی میں جگہ نہیں دی۔ ہم تو بڑی محبت سے آنکھ مچولی خریدتے ہیں۔ **محفوظ احمد، ٹنڈو آدم۔** آپ اچھے اچھے اور نئے کارٹون بھی شائع کیا کریں۔ میں اپنا بنایا ہوا ایک عدد کارٹون بھیج رہا ہوں۔ **محمد اسماعیل سرسانہ، نیو ملتان۔** آپ ادیبوں شاعروں اور اداکاروں کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کر ہی دیجئے۔ **قرۃ العین فخر، ہری پور ہزارہ۔** میں نے آپ کو "کوئک فلم" کے بارے میں مضمون بھیجا تھا لیکن آپ نے میرا مضمون نہیں چھاپا پتہ نہیں خیال میں آپ کو مجھ سے دشمنی ہو گئی ہے۔ **رانا اعظم علی گجراتی، اوکاڑہ۔** یہ بہت اچھا رسالہ ہے اس کی جتنی

تعریف بھی کی جائے کم ہے اس میں وہ تمام کچھ ہوتا ہے جس کی ہمیں پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ **عدنان محمود، کراچی۔** میں نے آپ کو پہلے بھی خط لکھا تھا۔ میں اتنی خوشی خوشی خط بھیجتا ہوں لیکن میرا نام ہی نہیں آتا۔ **حسنہ خلیل، میرپور آزاد کشمیر۔** میں نے فروری سے آنکھ مچولی کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ لیکن اب تو یہ کافی بدل چکا ہے۔ میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ انعامی مقابلے کی جگہ کوئی اور سلسلہ شروع کر دیں۔ یعنی تصویر دی جائے اور اس کا نام تجویز کرنا ہو۔ **کلثوم کاکڑ، کوئٹہ۔** میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ جو اتنی غیر معیاری بھی نہیں ہے۔ آنکھ مچولی اتنا اچھا ہے کہ اس کو میری تعریف کی ضرورت نہیں ہے۔ ○ ..... نظم میں وزن نہیں ہے۔ ابھی اور محنت کیجئے۔ **ایم اسلم خان، مظفر گڑھ۔** ایک خط ایک مسئلہ کا کالم بہت ہی زبردست ہے اس سے کافی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ **عمارہ احمد، لاہور۔** میری کہانی "جنت گم گشتہ" آپ تک پہنچی یا نہیں ....؟ ○ ..... جی نہیں **محمد عظیم انجم، سبی۔** آنکھ مچولی کی نمائندگی کے لئے آپ کب اعلان کر رہے ہیں تاکہ سبی میں بھی کوئی اس کا نمائندہ ہو۔ ○ ..... نمائندے اخبارات کے ہوتے ہیں۔ رسالے کے نہیں۔ **نصراللہ خان، نواب شاہ۔** برائے مہربانی آنکھ مچولی ویڈیو میگزین بذریعہ ڈاک ارسال فرما کر شکریہ کا موقعہ دیں۔ ○ ..... ڈیڑھ سو روپوں کا منی آرڈر بھیج دیجئے۔ **اسما سعید، لاہور۔** انکل ایک بات بتا دیجئے کہ معاوضہ صرف ان بچوں کو ملتا ہے جو ممبر شپ حاصل کرتے ہیں یا تحریریں بھیجنے والے باقی ساتھیوں کو بھی ملتا ہے۔ ○ ..... جس کی تحریر بھی شائع ہوتی ہے، اسے معاوضہ ملتا ہے۔ **سید علی عظیم، کراچی۔** جناب ہمیں آپ جیسے لوگوں سے اُنسیت ہو جاتی ہے ..... مطلب یہ ہے ان لوگوں سے جو اپنے کام کو دلچسپی سے کرتے ہیں۔ اب جیسے آپ نے آنکھ مچولی کے معیار کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ **سائرہ کنول ثنا، کوئٹہ کینٹ۔** فروری ۹۳ء کے شمارے میں انجم جاوید صاحب کا خط پڑھا، بڑا افسوس ہوا، ہاتھ قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ کیا ان کو اتنا بھی نہیں پتا کہ پاکستان کی پہلی الیکٹرک کار کے موجدوں نے الیکٹرک کار کے اخراجات یعنی ۷۰ ہزار کی رقم اپنی جیبوں سے ادا کی تھی۔ کیا نئی نسل اپنے پیسوں سے ایک فزکس لیبارٹری تک نہیں بنا سکتی؟؟ ریسرچ یا تحقیق کے لئے وسائل کی ضرورت ہے؟؟؟ **بشریٰ احسان، سرگودھا۔** اس دفعہ پیارا پیارا آنکھ مچولی جلد ہی مارکیٹ سے مل گیا۔ جس سے بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں تمام ہی تقریباً اچھی تھیں۔ **آصف پوپلزئی، لاہور۔** میں پچھلے چھ سات سالوں سے "آنکھ مچولی" کا مسلسل گاہک ہوں۔ اور اب شاید تیسری مرتبہ خط بھیج رہا ہوں لگتا ہے یہ بھی ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جائے گا۔ **شہناز قمر، چار سدہ۔** میرے پاس آنکھ مچولی کے بہت سارے شمارے جمع ہو چکے ہیں۔ آپ بتائیں کہ میں ان کا کیا کروں۔ اور میرے پاس پشاوری بانسری ہے۔ مجھے تھوڑی بہت بجانی تو آتی ہے مگر بے سُری۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اسے کسی کو قرعہ اندازی کے ذریعے دے دیں۔ کوئی تو ایسا ہوگا جو بانسری بجانا چاہتا ہوگا۔ **اصغر عباس، راولپنڈی۔** رسالہ بہت معلوماتی اور سبق آموز ہے۔ مگر افسوس کہ اس میں "پریکٹیکل سائنس ورک" کا نام و نشان نہیں ہے۔ مجھے سائنس سے جنون کی حد تک دلچسپی ہے۔ اسی لئے میں سائنس دان بننا چاہتا ہوں۔ **اسما نصیر، اسلام آباد۔** فروری کا شمارہ ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ بن یامین کے مضمون "پھر کیا ہوا؟" نے ایک اچھا اخلاقی سبق دیا۔ **شہباز اختر، نارتھ کراچی۔** میں تیسری جماعت میں پڑھتا ہوں اس لئے میری لکھائی اچھی نہیں ہے۔ میں یہ خط اپنی امی سے لکھوا رہا ہوں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ میرے خط کا ضرور جواب دیں گے۔

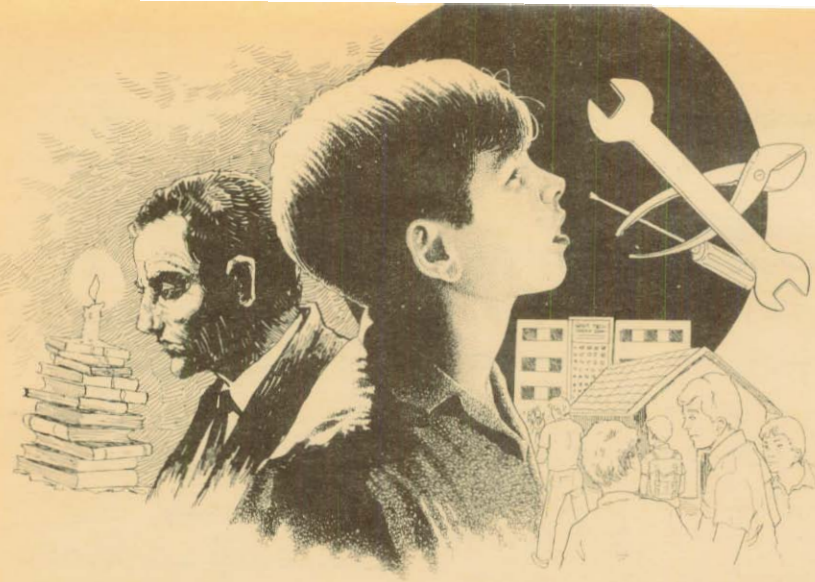

پلمبر

کلیم چغتائی

بچوں کو ہر قسم کی بدسلوکی، زیادتی اور بے حرمتی سے بچایا جائے گا۔

اسکول کا ہر بچّہ غضنفر کو جانتا تھا لیکن اس کا نام بہت کم بچوں کو معلوم تھا اور جن بچوں کو معلوم تھا بھی وہ بھی اسے غضنفر کہنا جیسے بھول گئے تھے۔ سب لوگ اسے پلمبر کہتے تھے۔

غضنفر نے تقریباً تین سال پہلے جب اسکول میں داخلہ لیا تھا، اس وقت اس کے چاچا نے اس کا نام غضنفر علی ہی لکھوایا تھا لیکن ہوا یہ کہ دو تین دن بعد ہی چھٹی جماعت کے کلاس ٹیچر، کلاس کے تمام بچوں کے نام اور والد کا نام پوچھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی پوچھتے جاتے کہ تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں۔ کوئی بچہ بڑے فخر سے بتاتا کہ میرے ابو ڈاکٹر ہیں ۔ کوئی بچّہ سینہ پھُلا کر جواب دیتا "سر! میرے والد محکمہ بجلی میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں"۔ کوئی بچہ سر اونچا کر کے کہتا "سر مرے بابا جو ہیں نا وہ چیف انجینئر ہیں"۔ غضنفر کی باری آئی تو وہ جھجکتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بھئی کیا نام ہے تمہارا؟" کلاس ٹیچر مسعود صاحب نے پوچھا۔

"غض ...... غضنفر علی سر۔"

"والد کا نام کیا ہے؟"

"سکندر علی"

"کیا کرتے تمہارے والد؟"

"وہ جی ...... غضنفر نے سر جھکا لیا۔ اس کی سانولی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

"میرے سوال کا جواب دو۔" مسعود صاحب نے سختی سے کہا۔

"سر ...... وہ پلمبر ہیں۔"

"ہیں ......!" اچانک بہت سے بچوں کے منہ سے نکلا اور پھر سارے بچے زور زور سے ہنسنے لگے۔ مسعود صاحب کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی جسے انہوں نے ضبط کر لیا۔ انہوں نے غضنفر کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا اور بولے۔

"خوب، تمہارے ابا نے پیشہ بھی اپنے نام کے قافیے کے ساتھ ملا کر چنا ہے ...... سکندر ...... پلمبر، خوب!"

بچے پھر ہنسنے لگے۔ مسعود صاحب نے ڈسٹر سے میز بجائی۔ سب بچے خاموش ہو گئے "ہاں بھئی تمہارا نام؟" مسعود صاحب اب غضنفر کے برابر بیٹھے لڑکے سے پوچھ رہے تھے

اس دن سے غضنفر کا اصلی نام سب بچے بھول گئے اور سب نے اسے پلمبر کہنا شروع کر دیا کیا بچے کیا اساتذہ، کیا چپراسی، سب اسے پلمبر ہی کہہ کر پکارتے۔

"سننا میاں پلمبر۔" "پلمبر یار اپنی کاپی دے دو۔" "پلمبر تم نے حساب کا کام کیوں نہیں کیا؟" شروع شروع میں تو غضنفر نے اپنے اس "نئے نام" پر بڑا احتجاج کیا۔ جب بھی کوئی اسے پلمبر کہتا وہ غصے سے کہتا۔ کتنی مرتبہ بتایا میرا نام غضنفر ہے۔ غضن ...... فر ...... سمجھے؟" لیکن بچے اس کو غصہ دلا کر اور خوش ہوتے۔ کوئی کہتا۔

"ارے یار تمہارے ابا پلمبر ہیں۔ ان کا نام سکندر ہے۔ کوئی انہیں سکندر کہتا ہے؟ نہیں کہتا نا؟" دوسرا بچہ ٹکڑا لگاتا۔

"اور پھر انہوں نے تمہیں بھی تو پلمبر کا کام سکھایا ہوگا۔ تم بھی اچھے خاصے پلمبر ہو گے۔ جونیئر پلمبر سہی۔!"

"ڈپٹی پلمبر کہو۔" ایک آواز آتی۔

"نہیں بلکہ ایڈیشنل اسسٹنٹ ڈپٹی پلمبر!!"

"ویسے خشک بھنگی بھی کہہ سکتے ہیں۔" غضنفر کو چاروں طرف سے ہونے والے یہ تبصرے سن کر ایسا لگتا جیسے وہ تیروں کی بارش میں کھڑا ہے اور اسے کوئی بچانے والا نہیں۔

کلاس کے ایک لڑکے محسن سے غضنفر کی شدید جھڑپ ہو جاتی تھی۔ محسن ریڈی میڈ ملبوسات کے ایک بڑے تاجر کا بیٹا تھا۔ اس کے والد ملبوسات ملک سے باہر بھی بھیجتے تھے۔ غضنفر سے محسن کو خواہ مخواہ کا بیر تھا۔ وہ جب بھی غضنفر کو دیکھتا کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیتا مثلاً وہ لہک کر

کہتا۔

" آیئے آیئے ڈپٹی پلمبر صاحب آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے اسکول کے جتنے باتھ روم ہیں، ان میں ٹونٹیوں سے پانی بہتا رہتا ہے۔ آپ ذرا باتھ روم میں آئیں۔ !"

غضنفر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا تو محسن کہتا۔

"اوہو، ناراض ہو گئے۔ بھئی سچ پوچھو تو تمہارے نام اتنا مشکل ہے، اتنا مشکل ہے کہ اس کی بجائے پلمبر بولنا ہی آسان لگتا ہے اور یوں بھی دیکھو تو "غضنفر" میں جتنے نقطے ہیں اتنے ہی نقطے "پلمبر" میں ہیں۔ فرق کیا ہے دونوں میں ؟"

ایک دن بچے اسکول پہنچے تو اسمبلی میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے اعلان کیا کہ آئندہ ماہ اسکول کا سلور جوبلی جشن منایا جائے گا۔ اس سلسلے میں تقریری مقابلہ، مشاعرہ، کھیلوں کے مقابلے، قومی نغموں کے مقابلے ہوں گے اور ایک یادگار پروگرام "میرا دبستان" کے عنوان سے ہو گا۔ اس میں ملک کی ایسی بہت سی مشہور شخصیات شریک ہوں گی جنہوں نے اپنے بچپن میں اس اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ جو بچے مختلف مقابلوں میں شرکت کرنا چاہتے ہوں وہ اپنے اپنے کلاس ٹیچر کے پاس اپنے نام لکھوا دیں۔

بچوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بہت سے بچے مختلف مقابلوں میں شرکت کے لئے اپنے نام لکھوانے لگے۔ غضنفر کی کلاس میں بھی نام لکھے جا رہے تھے۔ کلاس ٹیچر فیاض صاحب نے غضنفر سے بھی پوچھا۔ "ہاں بھئی پلمبر تم کس مقابلے میں حصہ لو گے؟"

تمام بچے کھکھلا کر ہنس پڑے اور ایک طرف سے آواز آئی۔ "سر یہ گانا سنائیں گے۔ میں ہوں پلمبر پاکستانی ...... میرا پانا انگلستانی ......"

کلاس میں قہقہوں کا طوفان سا آگیا۔ فیاض صاحب بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے لیکن انہوں نے فوراً ہی سب کو خاموش کروا دیا اور دوسرے لڑکوں کے نام لکھنے لگے۔ سب بچے بڑھ چڑھ کر تجویزیں دے رہے تھے۔ کسی کو یہ خیال نہ تھا کہ سب سے پچھلی نشست پر بیٹھے غضنفر کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔

سلور جوبلی کے پروگرام بہت شاندار تھے۔ اخبارات میں بھی ان کی خبریں شائع ہوئیں۔ آخری دن اس جشن کا سب سے اہم پروگرام "میرا دبستان" ہونا تھا اس پروگرام میں ملک کی اہم شخصیات آ رہی تھیں۔ اس لئے بہتر سے بہتر انتظامات کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب رات کو اپنے گھر ہی نہیں گئے اسکول میں ٹھہر کر جلسہ گاہ کے انتظامات کرواتے رہے یا پھر اپنے کمرے میں جا جا کر مختلف شخصیات کو ٹیلی فون کر کے کل کے پروگرام کی یاد دہانی کرواتے

رہے۔

صبح کے نو بجے پروگرام شروع ہونا تھا۔ اس پروگرام کے مہمان خصوصی کیمیا پر ملک کے سب سے بڑے تحقیقی ادارے (ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری) کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر محمد شوکت تھے۔ ڈاکٹر شوکت بہت مصروف آدمی تھے لیکن محض اپنے اسکول سے محبت کی وجہ سے انہوں نے اس پروگرام میں شرکت پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر شوکت تو پونے نو بجے ہی اسکول پہنچ گئے۔ اس وقت تک تو سارے اساتذہ بھی جلسہ گاہ میں نہیں پہنچے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بوکھلا کر اسکول کے صدر دروازے کی طرف بھاگے جہاں ڈاکٹر شوکت اپنی کار سے اتر رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں لے کر جلسہ گاہ میں آئے۔ آہستہ آہستہ پروگرام کے بیشتر مہمان جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ تقریباً ساڑھے نو بجے تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ہیڈ ماسٹر صاب نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا پھر دسویں جماعت کے استاد نعیم صاحب نے مائک سنبھال لیا۔ انہوں نے پہلے تو تمام مہمانوں کا تعارف کروایا۔ پھر ایک ایک کر کے مہمان کو اظہار خیال کی دعوت دینا شروع کر دی۔ ہر مہمان کو بلوانے سے پہلے وہ اس کا تفصیلی تعارف کرواتے کہ یہ شخصیت فلاں سن سے فلاں سن تک اس اسکول میں زیر تعلیم رہی۔ اس کے بعد انہوں نے فلاں فلاں تعلیم اداروں سے اس اس مضمون میں سند حاصل کی۔ آج کل وہ فلاں ادارے میں اس حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مہمانوں میں بہت سی مشہور شخصیات شامل تھیں۔ ان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمایاں فنکار بھی تھے۔ کرکٹ، ہاکی کے قومی ٹیموں کے دو تین کھلاڑیوں نے بھی اسی اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ ایک بڑے دواساز ادارے کے چیئرمین، قالینوں کے ایک بڑے ایکسپورٹر، وکلا کی بار ایسوسی ایشن کے صدر، امراض قلب کے ماہر ایک ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ ان سب نے مختلف زمانوں میں اسی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔

ہر مہمان نے اپنی تقریر میں بڑی دلچسپ باتیں کہیں۔ اپنے اسکول کے زمانے کی شرارتیں بیان کیں۔ تقریباً ہر ایک نے بتایا کہ وہ بہت دل لگا کر پڑھتے تھے۔ انہوں نے پرانے اساتذہ کو خراج تحسین پیش کیا۔ کئی مہمان تقریر کرتے ہوئے بڑے جذباتی ہوگئے اور رو پڑے۔

یہ بڑا یادگار پروگرام تھا۔

ریڈیو ٹی وی کا عملہ بھی یہاں پر موجود تھا اور اخباری نمائندے بھی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھے تیزی سے قلم چلا رہے تھے۔

سب سے آخر میں نعیم صاحب نے مہمان خصوصی ڈاکٹر شوکت کو خطاب کی دعوت دی۔ ان کا تعارف کرواتے ہوئے نعیم صاحب نے جوش سے کہا "اس اسکول کو اس بات پر فخر ہے کہ ڈاکٹر

شوکت جیسی مایہ ناز اور قابلِ قدر و احترام شخصیت نے اپنا زمانہ طالب علمی اس چہار دیواری میں گزارا۔ انہوں نے کینسر جیسے موذی مرض کی دوا دریافت کر کے پاکستان کا نام پوری دنیا میں سربلند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔"

تمام شرکا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور کئی منٹ تک تالیاں بجتی رہیں۔ ڈاکٹر شوکت ڈائس پر آئے تو وہ بہت سنجیدہ تھے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

میرے معزز اساتذہ کرام، مہمانانِ گرامی اور میرے عزیز بچّو۔ میں یہاں آنے سے قبل بہت سی باتیں سوچ کر آیا تھا لیکن ان باتوں کا ذکر کرنے سے قبل میں دو باتوں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ اپنی اس مادرِ علمی میں تقریباً بیس برس بعد لوٹنے پر میں نے فوری طور پر جو باتیں محسوس کیں وہ آپ کے سامنے لانا چاہوں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے۔" انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "اس یادگار تقریب کا آغاز نو بجے ہونا تھا لیکن یہ تقریب ساڑھے نو بجے شروع ہوئی۔ آپ کہیں گے کہ پاکستان میں یوں ہی چلتا ہے۔ کون سا پروگرام ہے جو وقت پر شروع ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایسا ہوتا ہے لیکن کیا ایسا ہونا بھی درست ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں نے تعلیم اور تحقیق کی غرض سے تیرہ برس امریکہ اور مختلف یورپی ممالک میں گزارے ہیں۔ وہ لوگ بہت سی برائیوں میں مبتلا ہیں لیکن انہوں نے وقت کی قدر کرنا سیکھ لیا ہے۔ آپ تو مستقبل کے معمار تیار کر رہے ہیں۔ ان بچوں کا آپ پر حق ہے کہ آپ انہیں اچھی تربیت دیں۔ انہیں وقت کی قدر کرنا سکھائیں۔

"دوسری بات! آج جب میں یہاں آ کر بیٹھا تو میں نے محسوس کیا کہ تقریب کے انتظامات شاید مکمل نہیں ہیں۔ قنات کے پیچھے سے اٹھنے والی آوازیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سر! باتھ روم کی ٹونٹیاں تو ٹوٹی ہوئی ہیں۔ ان کی جگہ نئی ٹونٹیاں کیسے لگیں گی؟" اس کے جواب میں میرے ایک استاد کی آواز آئی۔ "بھئی اس پلمبر کو بلاؤ۔ نائنتھ اے میں پڑھتا ہے وہ اس سے کہو کہ ان ٹونٹیوں کا کچھ علاج کرے۔" پھر کئی بچوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ پلمبر، او پلمبر، تمہیں سر بلا رہے ہیں۔" پھر کسی بچے کے غصہ سے بھری آواز سنائی دی۔ میں پلمبر نہیں غضنفر ہوں۔ اس کے جواب میں قہقہے بلند ہوئے اور کئی آوازیں آئیں۔

"ابن پلمبر تو ہو۔ پلمبر کے پتر!"

جلسہ گاہ میں گہرا سناٹا طاری تھا۔ ڈاکٹر شوکت چند لمحے خاموش رہے پھر ان کی آواز لاؤڈ

ممتا کی لازوال قربانی

روم (انٹرنیشنل ڈیسک) یوں تو انسانی تاریخ بچوں کے لئے ماؤں کی قربانیوں سے بھری پڑی ہے لیکن اٹلی میں ایک ۲۸ سالہ عورت "کارلا لیوانی" نے اس میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ شمالی اٹلی کی اس عورت کو قابل علاج سرطان تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اگر وہ کینسر کے علاج کی دوائیں لیتی تو اس کے پیٹ میں موجود بچے کی جان کو خطرہ تھا۔ اس لئے اس نے بچے کی پیدائش تک دوائیں لینے سے انکار کر دیا۔ دو روز قبل اس نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا لیکن علاج میں تاخیر کے باعث اسے لاحق سرطان تشویش ناک صورت اختیار کر گیا اور وہ بیٹے کو زندگی دے کر خود زندگی سے منہ موڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے اس کے قربانی کے جذبے کی بہت تعریف کی اور کہا کہ "کارلا لیوانی" کی موت ایک آرٹسٹ کی موت ہے جو اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ کر مرتا ہے۔

روزنامہ پاکستان، لاہور ۲ فروری ۹۳ء

اسپیکروں سے گونجی۔ آپ لوگ سوچیں گے کہ میں محض سنی سنائی باتوں کی اتنی اہمیت دے رہا ہوں لیکن میں اس کی وجہ بھی بیان کرتا ہوں۔ پہلے میں اس بچے سے کیا نام تھا اس کا غضنفر سے ملنا چاہوں گا" یہ کہہ کر ڈاکٹر شوکت ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ سب سے آخری نشستوں سے ایک سانولا سا دبلا پتلا لڑکا اٹھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اسٹیج پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر شوکت نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ سر پر ہاتھ پھیرنا تھا کہ غضنفر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور تسلی دینے لگے جب اس کے آنسو ذرا تھمے تو ڈاکٹر صاحب نے اسے اپنی کرسی پر بٹھا دیا اور خود مائک پر آکر کہنے لگے۔

"میں نے اس بظاہر چھوٹے سے "سنے سنائے واقعے" کو اتنی اہمیت اس لئے دی ہے کہ میں سمجھتا ہوں، تعلیم سے انسان میں اتنی تہذیب آجانی چاہئے کہ وہ انسانیت کا احترام کرنے لگے۔ کوئی فرد اس لئے کمتر نہ ہو کہ وہ پلمبر مزدور، بڑھی یا خاکروب سے یا ایسے کسی فرد کا بیٹا ہے بلکہ عزت کا معیار وہی ہو جو اس کائنات کے رب نے دیا ہے یعنی تم میں سے عزت والا وہی ہے جو تقویٰ میں زیادہ ہے یعنی اپنے رب سے جو سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔

مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔ ڈاکٹر شوکت کہہ رہے تھے۔ "میری اپنی درسگاہ میں طالب علموں کے ساتھ یہ سلوک ہو کہ انہیں پلمبر یا پلمبر کا بیٹا کہہ کر توہین آمیز انداز سے بلایا جائے اور ان کا اصل نام لینے کی زحمت نہ کی جائے آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں اس بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہوں؟" ڈاکٹر شوکت کہتے کہتے رک گئے انہوں نے پوری جلسہ گاہ کا جائزہ لیا۔

"میں اس بات کو اتنی اہمیت اس لئے دے رہا ہوں کہ میں خود ایک مزدور کا بیٹا ہوں۔ میرے والد موچی تھے!"

جلسہ گاہ کے تمام شرکا پر جیسے بجلی گر پڑی۔ سب چونک کر اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر شوکت کی آواز گونج رہی تھی۔

"اگر محنت کر کے رزقِ حلال کمانا عیب کی بات ہے تو پھر آپ مجھے بھی موچی کا بیٹا کہہ کر میرا مذاق اڑائیں، لیکن مجھے اس بات پہ فخر ہے کہ میرے والد نے زندگی بھر محنت کر کے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالا اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔"

ڈاکٹر شوکت نے رک کر اپنی آنکھوں میں آجانے والے آنسو پونچھے۔ پھر وہ بولے! "بچوں کا یہ حق ہے کہ ان کی عزت کی جائے اور انہیں دوسروں کی عزت کرنا سکھایا جائے۔ اگر آپ .....کسی بچے کو اس کے والد کے پیشے کے طعنے دے کر ذلیل کرتے رہیں گے تو آپ بہت بڑا گناہ کریں گے اور مستقبل کے ایک معمار کو کھو دیں گے۔"

پھر وہ اپنی کرسی کی طرف مڑے اور اس پر بیٹھے ہوئے غضنفر کا ہاتھ تھام کر اسے اسٹیج پر حاضرین کے سامنے لے آئے۔ غضنفر پھر رو پڑا۔ ڈاکٹر شوکت نے اس کے گال تھپتھپائے اور بولے۔

"کمال ہے تم رو رہے ہو۔ بیٹے! پتا ہے غضنفر کے کیا معنی ہیں؟ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں شیر، بہادر آدمی۔ تمہیں تو بہادر بننا ہے اور مجھے تو پوری امید ہے کہ آج کے بعد تمہیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔ اب تمہیں عزت ملے گی۔ محبت ملے گی اور تمہیں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اس اسکول کا اور اپنے ملک کا نام دنیا بھر میں روشن کرنا ہے۔"

غضنفر نے آنسو پونچھ لئے۔ اب اس کا چہرہ امید کی کرنوں سے جگمگا رہا تھا۔

جلسہ ختم ہوا تو غضنفر ڈائس سے اترا۔ اسے کسی نے گلے لگالیا۔ یہ محسن تھا جو کہہ رہا تھا۔ "تم نے ہمیں معاف تو کر دیا ہے نا غضنفر؟"

بچوں کا عالمی دن کب اور کیسے شروع ہوا

بچّوں کا عالمی دن دنیا میں پہلی مرتبہ آج سے ۳۹ سال پہلے ۱۹۵۳ء میں منایا گیا جس کا انتظام بچّوں کی بھلائی کی ایک انجمن نے کیا اور اس میں ۴۰ ملکوں نے حصہ لیا۔ اگلے ہی سال اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بچوں کا عالمی دن ہر سال منانے کی منظوری دے دی۔ آج کل یہ دن دنیا کے ۱۴۹ ملکوں میں منایا جاتا ہے۔ ۱۹۹۲ء سے یہ دن ساری دنیا میں ۲۰ نومبر کو منایا جاتا ہے کیونکہ اس دن ۱۹۸۹ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بچوں کے حقوق کا معاہدہ منظور کیا تھا۔ اس دن کی اہمیت کے پیشِ نظر اقوامِ متحدہ ادارہ اطفال یونیسیف کے انتظامی بورڈ نے گزشتہ جون میں ایک قرار داد منظور کی ہے کہ بچّوں کا عالمی دن ہر سال ۲۰ نومبر کو منایا جائے۔ حکومتِ پاکستان نے اس قرار داد کی روشنی میں اب بچوں کا عالمی دن ہر سال ۲۰ نومبر کو منانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اگر ایسا ہو جائے

عابد محمود علی

ایک بچّے کے دلچسپ تاثرات
والدین کے لئے خصوصی تحریر

بچّے کی عزت نفس کا خیال رکھا جائے گا

اس روز اچانک ایک عجیب سا خیال میرے دماغ میں کُلبلانے لگا اگر دنیا کو سر کے بل کھڑا کر دیا جائے تو کتنی دلچسپ بات پیدا ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر بچّوں کو گھر کا مالک بنا دیا جائے تو وہ بزرگوں سے کس طرح پیش آئیں گے ؟

سب سے پہلے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر میں اپنی ممّی پر حکم چلانا اور بات بات پر انہیں ڈانٹنا اور ٹوکنا شروع کر دوں تو ان کی کیا حالت ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ اسے نہ تو میرے ڈیڈی پسند کریں گے اور نہ ہی دادی اماں۔

میں ان لوگوں سے بالکل ویسا ہی برتاؤ کروں گا جیسا کہ یہ لوگ میرے ساتھ کرتے ہیں۔ جب رات کو ممّی کھانے کی میز پر کھانا کھا رہی ہوں گی تو میں ان سے کہوں گا۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہو، بغیر روٹی کے ساری ترکاری چٹ کر گئیں! اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں؟ کیسی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ ٹھیک طرح سے کھاؤ کھانا"۔

میری اس ڈانٹ پر ممّی سہم کر چُپ چاپ ترکاری سے روٹی کھانے لگیں گی۔

لیکن میں پھر چلاّؤں گا۔

"اتنا بڑا نوالہ مت توڑو۔ چھوٹا کرو اور خوب چبا چبا کر کھاؤ۔ کس خیال میں کھو گئی ہو، کھانا جلدی ختم کرو اور کرسی ہلانا بند کرو۔"

ڈیڈی دفتر سے جب آئیں گے تو اس سے قبل کہ وہ کپڑے تبدیل کریں میں چیخ پڑوں گا۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی؟ ہمیشہ انتظار کراتے ہو۔ دفتر سے نکل کر راستے میں کہاں رک گئے تھے؟ اب کھڑے کیا ہو، جاؤ ہاتھ منہ دھو کر آؤ۔ اور سُنو غسل خانے میں گندگی مت پھیلانا اور تولئے کو کھونٹی پر ٹانگ کر آنا"۔

اور جب وہ غسل خانے سے فارغ ہوکر آئیں گے تو میں کہوں گا۔

"ادھر آؤ! ذرا اپنے ناخن تو دکھاؤ۔ ارے کتنے گندے ہیں۔ انہیں کاٹتے نہیں ہو، جاؤ قینچی لاؤ، چیخو نہیں صرف ناخن کٹیں گے۔ میں تمہاری انگلی نہیں کاٹوں گا۔ جاؤ کھانا کھاؤ۔" ڈیڈی ممّی کے پاس میز پر جاکر بیٹھ جائیں گے اور ممّی سے کھُسر پھُسر کریں گے تو میں بیچ میں ٹوک دوں گا۔

"خاموشی سے کھانا کھاؤ، باتیں بعد میں کر لینا۔ کھاتے وقت باتیں کرنا بُری عادت ہے۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ کھاتے وقت اخبار نہیں پڑھتے۔ لاؤ اخبار ادھر دو"۔

جب دادی اماں کمرے میں داخل ہوں گی تو میں دھاڑوں گا۔ "وہیں رک جاؤ اور جوتے جھاڑ کر اندر آؤ۔ سارا قالین خراب کر دیا۔ ہمیشہ کھیلتی رہتی ہو، اور کوئی کام نہیں ہے تمہیں ؟ ہر وقت چھڑی اُٹھائے پھرتی ہو کسی کی آنکھ میں لگ جائے تو؟" ابھی میں اپنے خیالوں میں گم تھا اور دادی اماں پر کوئی نیا حکم چلانے ہی والا تھا کہ اچانک ممّی نے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "کھانے کی میز پر ہی سو جاتے ہو، آخر تمہیں کب تمیز آئے گی۔ اسی لئے تو تمہاری صحت چوپٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ آئینے میں شکل دیکھی ہے اپنی۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں...... !!!"

کرنیں

(۱) مظلوم کی بد دعا سے ڈرو کیونکہ اس کی بد دعا شعلے کی طرح آسمان کی طرف جاتی ہے۔

(۲) خدا کی رضامندی ماں باپ کی رضامندی میں ہے۔

(۳) وہ شخص خدا اور خدا کے رسولؐ کا دوست ہے جو دوسروں کے راز کو چھپائے۔

(۴) علم کے بغیر خدا کی پہچان نہیں ہو سکتی۔

(۵) زبان کو شکوہ سے روکو تاکہ تمہیں خوشی کی زندگی عطا ہو۔

(۶) سب سے بہترین وہ لقمہ ہوتا ہے جو اپنی محنت سے حاصل کیا جاتا ہے۔

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے۔

دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ کی شرح -/۳۰۰ روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہ نامہ آنکھ مچولی - 1 - پی - آئی - بی کالونی، کراچی - ۵

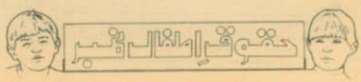

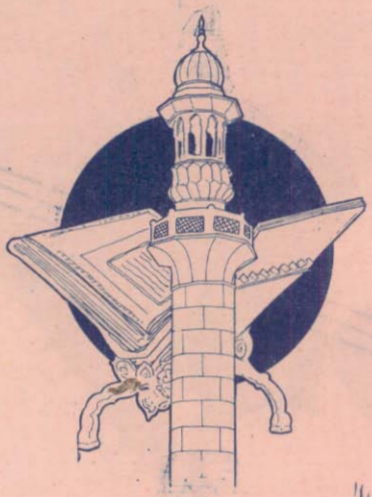

حمد باری تعالیٰ

مرسلہ: عدنان عزیز بلوچ

حمد تیری نہ جو بیان کریں
تیری جانب جو نہ دھیان کریں
ہم کو آتا نہیں ہے چین ذرا
دل میں رہتا ہے سب کے تو اے خدا
تیرے بندے نہیں جو ہم مولا
بندگی کے طریقے ہم کو سکھا
ہم نہ بھٹکیں سدا یوں دنیا میں
تجھ سے مانگیں تو ہی دے گا ہمیں
دل کا آرام روح کو پاکیزگی
کریں دن رات ہم تیری ہی بندگی

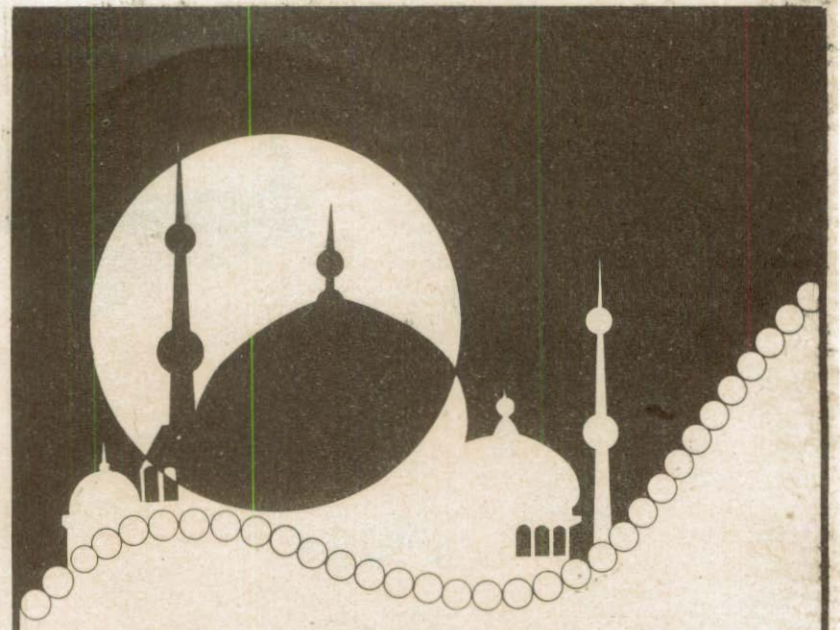

خلیفہ چہارم

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

آپ کا اسمِ مبارک علی، لقب حیدر اور کنیت ابو تراب تھی۔ آپ حضرت ابو طالب کے فرزند اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ رسول اللہؐ نے جب نبوت کا اعلان کیا تو آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان کی تائید کی اور ایمان لائے۔

آپ بچوں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔ جنگِ تبوک کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے۔ آپ کی عظیم جنگی خدمات کے صلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو شیرِ خدا کا لقب دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے آپ کو خلیفہ مقرر کیا۔ آپ بیت المال کو ہمیشہ قومی امانت سمجھتے تھے۔ آپؓ کی شہادت ۲۱ رمضان المبارک کو ہوئی

شہلا صدیقی، ٹنڈو آدم

یتیم سے شفقت

شرجیل خالد، کراچی

حضورؐ عید کی نماز پر تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں آپؐ نے دیکھا کچھ لڑکے کھیل رہے ہیں۔ ان میں ایک لڑکا الگ بیٹھا تھا اور رو رہا تھا، کپڑے بھی پُرانے پہنے ہوئے تھا۔

آپؐ اس کے پاس گئے۔ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا "کیوں رو رہے ہو؟ دوسرے لڑکوں کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتے؟" لڑکے نے حضورؐ کو نہیں پہچانا۔ کہنے لگا۔ "میرے باپ لڑائی میں رسول اللہ کی خاطر شہید ہو گئے۔ میری ماں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میری ماں کے دوسرے شوہر نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ نہ میرے پاس کپڑے ہیں نہ کھانے کو کچھ ہے۔ سارا دن مزدوری کرتا ہوں۔ شام کو ان کے ساتھ کھیلنے آتا ہوں تو کوئی میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔ اس لئے رو رہا ہوں۔" (حضورؐ) رسول اللہ نے فرمایا: "اگر محمدؐ تمہارے باپ، عائشہؓ تمہاری ماں علیؓ تمہارے چچا اور حسنؓ اور حسینؓ تمہارے بھائی ہوں تو تم کیا محسوس کرو گے؟" لڑکے نے آپؐ کو پہچان لیا۔ کہنے لگا "میرے باپ آپؐ پر قربان ہوئے، میں آپؐ پر قربان۔ کیوں نہ خوش ہوں گا۔" اس کی باتیں سن کر حضورؐ اسے گھر لے گئے اسے صاف ستھرا لباس پہنایا، کھانا کھلایا اور اس پر شفقت فرمائی۔

بچّوں سے محبت کریں

ناصر حسین قادری، کراچی

یہ چیزیں بچّے کی شخصیت کے لئے نقصان دہ ہیں۔

(۱) بچّے کو سوال کرنے پر جھڑک دینا
(۲) بات بات پر اس کی حوصلہ شکنی کرنا
(۳) اس پر توجّہ نہ دینا
(۴) ذرا ذرا سی باتوں پر اسے مارنا پیٹنا
(۵) اس سے محبّت کا اظہار نہ کرنا

یاد رکھئے! بچّے محبت اور توجّہ کے طالب ہوتے ہیں۔ انہیں پیار، محبّت، شفقت، مناسب توجہ، اچھی تعلیم و تربیت اور اچھے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھے ماحول سے مراد ماں باپ کا رویّہ ہے۔ ماں باپ کا جھگڑا بچے کی ذہنی صلاحیت کو بُری طرح متاثر کرتا ہے۔ گھر کے ماحول میں سکون، امن و خوش ہو تو بچّہ بھی خوش رہتا ہے اور کسی بھی طور احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتا ہے۔

بچّوں سے پیار کیجئے، انہیں اچھا ماحول فراہم کیجئے اور انہیں خوش رکھئے۔ یہ ان کا حق ہے۔

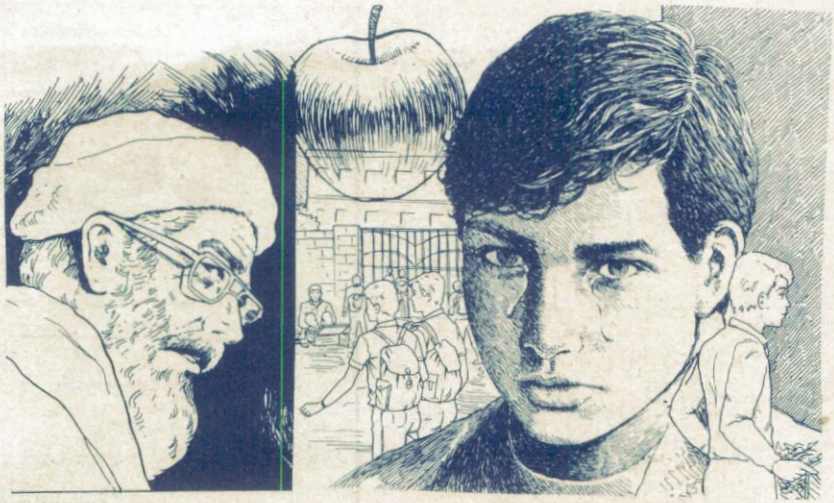

داغ والا سیب

فہد علی خان، کراچی

میں پہلے سیب بہت شوق سے کھاتا تھا لیکن اب میں نے سیب کھانا چھوڑ دیئے ہیں۔ سیب کھاؤں گا تو بابا یاد آئے گا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جب بھی اسکول جاتا تو گلی کے موڑ پر مجھے پھل والا بابا نظر آتا جو سیب بیچا کرتا تھا۔ لمبا چوڑا قد، کسرتی جسم، روشن چہرہ، سفید براق داڑھی اور چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ سمیٹے وہ سر جھکائے کسی سوچ میں گم نظر آتا۔ میں اس کے ٹھیلے پر بکھرے سیبوں میں سے سب سے اچھا سیب تلاش کرتا پھر ازراہِ مذاق کہتا: "چاچا! سیب تو صحیح بیچا کرو یہ دیکھو داغ والا سیب۔" میری بات سن کر بابا ناراض ہو جاتا۔

"پاغل ہو غیا ہے کیا۔ اے دیکو بالکل صاف ہے۔" (پاگل ہو گیا ہے کیا اے دیکھو! بالکل صاف ہے) بابا دو تین سیب اٹھا کر مجھے دکھاتا اور میں جلدی سے بابا کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ تھما کر، منہ چڑاتا ہوا بھاگ لیتا۔ میرے منہ چڑانے کا وہ کبھی برا نہ مناتا بلکہ خود بھی بچّوں کی طرح مجھے منہ چڑانے لگتا۔

لیک سیب کھانا اور بابا کو منہ چڑانا میرا روز کا معمول تھا۔ ایک روز جیسے ہی میں گلی میں داخل ہوا تو پھل والے بابا کا ٹھیلا نظر نہیں آیا۔ میں نے اسکول کے لڑکوں سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ بابا کا

رات انتقال ہو گیا ہے۔

لڑکوں نے بتایا۔ بابا کے پھیپھڑوں میں داغ لگ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے محنت مزدوری سے منع کیا تھا لیکن گھر کا تمام خرچہ بابا کی محنت مزدوری پر ہی چل رہا تھا۔ پھر وہ بھلا کس طرح کام چھوڑ سکتا تھا۔ چھٹی میں جب میں گھر آیا تو مجھے بالکل بھوک نہیں تھی۔ بستہ میز پر رکھ کر یونیفارم اُتارے بغیر میں بستر پر لیٹ گیا اور سر پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

اتنے میں امّی کمرے میں داخل ہوئیں اور میری آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر بولیں:

"لگتا ہے آج جناب کی کلاس میں پٹائی ہوئی ہے۔" "نہیں امّی جان!" میں نے آہستگی سے کہا۔

"تو پھر یقیناً ڈانٹ پڑی ہوگی!!"

"نہیں امّی جی!"

"اچھا تو پھر کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہو رہی آپ کی؟" امّی جان کا لہجہ خاصا تشویش آمیز تھا۔

"نہیں امّی جان! میں بالکل ٹھیک ہوں!!!"

اتنا کہہ کر میں بستر سے اٹھا اور امّی کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔

"امّی! اب میں کبھی سیب نہیں کھاؤں گا۔ بابا مر گیا ہے۔" ٹوٹے پھوٹے الفاظ میرے منہ سے ادا ہوئے اور نہ جانے اچانک کہاں سے بہت سارے آنسو میری آنکھوں سے بہنے لگے۔

امّی حیران ہو کر مجھے دیکھ رہی تھیں اور میرے تصوّر میں پھل والا بابا اور اس کے داغ والے سیب گھوم رہے تھے۔

بابا سے اگرچہ میرا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن انسان ہونے کے ناطے ایک تعلق ضرور تھا۔ اسی تعلق کو یاد کر کے میں رو رہا تھا۔ ●

انمول موتی

مرسلہ: عبدالعظیم، کراچی

- یہ غلط ہے کہ وقت گزر جاتا ہے۔ وقت ٹھہرا رہتا ہے دراصل ہم گزر جاتے ہیں۔
- انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں صرف کرتا ہے اتنی محنت میں خامی دور کی جا سکتی ہے۔
- اپنی مسکراہٹ سے کسی کا دل جیت لینا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔
- محبّت تقسیم ہونے سے کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے۔
- ایثار و قربانی کا دوسرا نام محبّت ہے۔
- خوشیاں وہیں پروان چڑھتی ہیں جہاں اعتماد ہوتا ہے۔

بچّے ہمارا سرمایہ ہیں

پرنس محمد اکرم سیالوی، ننکانہ صاحب

اسے کل رات سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ بھوک کی شدّت سے وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ بھوک کی حالت میں بڑے سے بڑا انسان بھی لقمہ چھین لیتا ہے، وہ تو ابھی معصوم بچّہ تھا، بچپن میں اس کے والدین ایک حادثے میں چل بسے تھے اور وہ اس دنیا میں مصائب کا پہاڑ عبور کرنے کے لئے اکیلا رہ گیا تھا۔ والدین کے تصوّر سے دو آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک کر رہ گئے لیکن اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔

بھوک رہ رہ کر اسے ستا رہی تھی...... اچانک ایک کار تیزی سے اس کے سامنے سے گزری اور کچھ دور جا کر رک گئی۔ بچّے نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ کچھ فاصلے پر شامیانے نصب ہیں جن میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ کار سے ایک ادھیڑ عمر کا خوش پوش آدمی اُترا، اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر رعونت طاری تھی۔ وہ نہایت شان سے تقریب کا افتتاح کرنے کے بعد اسٹیج پر مہمان خصوصی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد اسٹیج سیکریٹری نے اسے اظہارِ خیال کی دعوت دی، فوٹو گرافروں کے کیمروں کی روشنیاں اس پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے تقریر اس طرح شروع کی:۔ "عزیز سامعین! آپ جانتے ہیں کہ بچّے ہمارا سرمایہ ہیں۔ ہماری قوم کا مستقبل ہیں۔ کل انہیں ہمارے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ سڑکوں پر پھرنے والے ان بے بس غریب بچّوں کو دیکھئے۔ ان کی مدد کیجئے، ورنہ کل یہی بچّے معاشرے پر بوجھ بن جائیں گے۔"

جلسہ برخواست ہوا تو وہ بڑا آدمی اپنی کار میں بڑی شان سے بیٹھا اور کار چل پڑی۔ وہ بچّہ جو دنیا میں اکیلا تھا، بھاگتا ہوا کار کے قریب پہنچا جو قریب ہی سگنل پر رک گئی تھی۔ "سیٹھ صاحب! میرا دنیا میں کوئی نہیں کل رات سے میں بھوکا ہوں۔ مجھے دوپہر کا کھانا کھلوا دیں۔" بچّے کا ننھا سا ہاتھ سوالی کی طرح پھیل گیا۔

بڑا آدمی کار سے باہر نکلا۔ اس نے زور سے ایک تھپڑ بچّے کے گال پر مارا۔ بچّہ سہم کر بھاگ نکلا اور بڑا آدمی کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا بریف کیس کھولا۔ اس میں سے ایک خوبصورت سا کاغذ نکلا۔ کاغذ پر تقریر لکھی ہوئی تھی۔

بڑا آدمی سر جھٹک کر تقریر یاد کرنے لگا۔ اسے ایک اور اسکول کے جلسہ میں شرکت کرنا تھی۔

وہ بڑا آدمی "بچّوں سے محبت کرو" کے عنوان پر تقریر یاد کرنے لگا۔

مُساوات

عشرت علی، ساہیوال

اسلام کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت اس کی یہ تعلیم ہے کہ دنیا کے سارے انسان حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں۔ اس لئے اسلام کی نظر میں کالا اور گورا، غلام اور آقا، امیر اور غریب سب برابر ہیں۔ اللہ کے نزدیک کسی انسان کی سب سے بڑی خوبی تقویٰ کی ہے۔ وہ انسان ہی اس ذات پاک کے نزدیک افضل ہے جو نیک کام کرتا ہے۔ ہمارے نبی اکرمؐ جو تمام جہان کے آقا اور سردار ہیں، اپنے لئے امتیاز پسند نہیں فرماتے تھے۔

مُساوات کی چند روشن مثالیں آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ ایک سفر میں کھانا پکانے کے لئے صحابہؓ نے آپس میں کام تقسیم کئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام میں کروں گا۔" صحابہ نے کہا "حضور آپ پر ہمارے ماں باپ قربان آپ یہ کام کیوں کریں؟ ہم جو حاضر ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا "میں اپنے ساتھیوں میں رہ کر ایسا امتیاز پسند نہیں کرتا۔"

اسی طرح جنگِ خندق کے موقع پر حضورؐ نے تمام صحابہ کے ساتھ مل کر کام کیا جس سے چہرۂ مُبارک اور جسمِ اطہر دھول اور مٹّی سے اٹ گیا۔

ایک جگہ سخت چٹان آگئی۔ صحابہ نے بڑی کوشش کی نہ ٹوٹی تو حضورؐ نے کہا "اسے میں توڑوں گا" اور پھر کدال سے ایسی ضرب لگائی کہ چٹان پاش پاش ہو گئی۔

حضرت علیؓ کا دورِ حکومت تھا۔ جب آپ اپنی زرہ کی چوری کے سلسلے میں ایک یہودی کے خلاف مقدمہ لے کر قاضی شریح کے پاس گئے تو قاضی نے آپ کو "ابو تراب" کہہ کر مخاطب کیا یہ بات حضرت علیؓ کو ناگوار گزری (کنیت سے پکارنا عزّت و احترام کی علامت ہے) آپؓ نے فرمایا کہ "تم نے مجھے کنیت سے پکارا ہے حالانکہ یہ موقع مجھے ترجیح دینے کا نہیں۔"

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت کا ہے۔ حضرت عمرؓ ایک مقدمے میں فریق کی حیثیت سے عدالت میں گئے۔ جب قاضی نے خلیفۂ وقت کو دیکھا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن حضرت عمر نے اس بات کو سخت ناپسند کیا اور فرمایا "یہ پہلی ناانصافی ہے جو تم نے اس مقدمے میں کی۔" یہ کہہ کر آپ دوسرے فریق کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہمیں بھی اپنے آپ کو کسی پر فوقیت نہیں دینی چاہئے۔ چاہے ہم کچھ بھی ہوں۔ اللہ نے ہم کو ایک ہی مٹّی سے پیدا کیا ہے اور اسلام نے تو رنگ و نسل اور زبان کے امتیاز کو ہی ختم کر دیا ہے۔

باادب بانصیب

نوید احمد لودھو، جیکب آباد

ایک بچّہ تھا بہت پیارا سا۔ اس کی عادتیں بھی اچھی تھیں۔ وہ بہت ذہین اور محنتی تھا اور اپنا ہر کام دل لگا کر کیا کرتا تھا۔

اپنے ماں باپ کا کہا مانتا اور ان کی خوب خدمت کرتا تھا اور بچّو! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے پیارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی خدمت کرنے کی کتنی ہدایت فرمائی ہے اور جو کوئی بھی رسول اللہ کی نصیحت پر عمل کرے اور ماں باپ کی فرماں برداری کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ اب بچّے کو اس بات کا علم تھا اس لئے وہ والدین کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رات کے وقت اس کی امّی کو پیاس لگی تو انہوں نے اس سے پانی مانگا۔ وہ بھاگا ہوا پانی لینے گیا۔ دیکھا تو گھڑا خالی تھا۔ کنواں بہت دور تھا۔ پھر بھی دوڑا ہوا گیا اور کنویں سے پانی لے آیا۔ جب اپنی امّی کو پانی دینے لگا تو وہ سو رہی تھیں۔ اس نے سوچا امّی سارا دن کام کر کے تھک جاتی ہیں۔ میں انہیں جگاؤں گا تو ان کی نیند خراب ہو جائے گی۔ اگر سو جاؤں گا تو ان کی آنکھ کھُلے گی اور وہ پیاس سے پریشان ہوں گی۔ میں یہیں کھڑا انتظار کرتا ہوں تاکہ جب وہ جاگیں تو ان کو پانی دے دوں۔ بچّہ کھڑے ہو کر ماں کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ آدھی رات کو اس کی امّی کی آنکھ کھُلی تو انہوں نے دیکھا کہ بیٹا پانی لئے کھڑا ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم اس وقت سے کھڑے ہو۔ بچّے نے کہا "جی ہاں!" یہ سن کر اس کی امّی بہت خوش ہوئیں اور اسے دُعا دی کہ وہ بہت بڑا آدمی بنے۔ اللہ نے ماں کی دُعا قبول کی اور یہ بچّہ بڑا ہو کر بہت بڑا عالم بنا۔ دُنیا انہیں حضرت شرف الدینؒ کے نام سے جانتی ہے۔

نیکی کیا ہے

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو۔ بلکہ ساری نیکی یہ ہے کہ تم:

اللہ پر ایمان لے آؤ۔

فرشتوں پر ایمان لے آؤ۔

اللہ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید پر ایمان لے آؤ۔

پیغمبروں پر ایمان لے آؤ۔

اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، بیواؤں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کی رہائی میں خرچ کرو اور نماز پڑھو، روزہ رکھو اور زکوٰۃ دو۔ (البقرہ)

مرسلہ: محمد سلیم امام، متحدہ عرب امارات

کلی کا لڑکا

عمران احمد شفیق

دوسروں کو سردی سے بچانے والا خود سردی پر قربان ہو گیا۔

پیر بخش پہاڑی سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا کلی کی طرف جا رہا تھا۔ کلی بلوچی زبان میں گاؤں کو کہتے ہیں۔ پیر بخش آٹھ نو برس کا بلوچ لڑکا تھا۔ پیر بخش کا گاؤں جن پہاڑیوں میں تھا، وہاں سردیوں میں خوب برف پڑتی تھی۔ پہاڑ، میدان، راستے اور کلی کے کچّے مکان برف سے ڈھک جایا کرتے تھے۔ برف پڑنے سے پہلے بوڑھے آسمان کا رنگ دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ برف پڑنے والی ہے۔ پھر جب آسمان سے برف کے گولے اُڑ اُڑ کر زمین پر بکھرنے لگتے تو کلی کے لڑکے حیران رہ جاتے۔ وہ سوچتے کہ آخر یہ بڑے بوڑھے آسمان کی طرف دیکھ کر یہ بات کیسے بتا دیتے ہیں؟

اس دن بھی جب پیر بخش اپنے ماموں سے ملنے اپنی کلی سے چار میل دور "کولپور" جانے لگا تو بوڑھے چرواہے چراغ علی نے اسے ٹوکا۔ "دیکھو لڑکے! دور نہ جانا۔ شام سے پہلے برف باری

شروع ہو جائے گی۔"

"دادا، ماموں کے پاس "کولپور" جا رہا ہوں۔ ماں نے بچّوں کے لئے گرم کپڑے بھیجے ہیں۔" پیر بخش نے پوٹلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

بوڑھے نے شاید اس کی بات نہیں سُنی۔ وہ غور سے مٹیالے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پیر بخش اس راستے کی طرف بڑھ گیا جو پہاڑی سڑک کی طرف جاتا تھا۔ بڑے میاں نے ٹھیک ہی کہا تھا، "کولپور" سے واپسی پر ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ برف باری ہونے لگی۔ پیر بخش نے گرم چادر اچھی طرح جسم سے لپیٹ لی اور تیز تیز چلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں سارے پہاڑ برف سے ڈھک جائیں گے۔ زمین پر، درختوں، پر مکانوں کی چھتوں پر ہر طرف

برف ہی برف نظر آئے گی۔ برف باری کی رفتار میں خاصی تیزی آگئی اور کلی کا لڑکا سردی سے ٹھٹھرنے اور کانپنے لگا۔ اس نے جسم پر گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اوپر سے گرم چادر بھی اوڑھی ہوئی تھی لیکن یخ قسم کی ہوائیں اس کے جسم کو جیسے چھید رہی تھیں۔ پیر بخش کے ہاتھ پاؤں سردی سے جمنے لگے۔ برف باری کے ساتھ تیز اور یخ ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں تھیں۔ پیر بخش کو اپنے قدم اٹھانا دُوبھر ہو رہا تھا۔ سردی اور یخ ہواؤں سے بے سدھ ہو کر کلی کا ننھا اور کمزور سا لڑکا پیر بخش برف کے ڈھیر پر گر گیا۔ آسمان سے گرتی ہوئی برف تیزی سے اس کو ڈھانپنے لگی۔

مستقبل کے معمار

صادقہ دلدار، جھمرہ سٹی

ہم ہیں مستقبل کے معمار
سب کے سہتے ہیں آزار

کوئی خطا جب ہم سے ہو
ہم پر ہوتی ہے پھٹکار

مانگیں جب ہم چیز کوئی
ہم کو دیتے ہیں دُھتکار

مانا یہ ہیں لوگ بڑے
کم ہے ان میں سوچ بچار

ہم ہیں مستقبل کے معمار
سب کے سہتے ہیں آزار

کیا آپ کو معلوم ہے؟

آصف خان، کراچی

(۱) پاکستان کی جانب سے پہلی وکٹ خان محمد نے لی تھی۔

(۲) برطانیہ کی سب سے بڑی کاؤنٹی یارکشائر ہے۔

(۳) پاکستانی فرسٹ کلاس کرکٹر عبدالعزیز وہ کھلاڑی ہے۔ جو گیند لگنے سے انتقال کر گئے تھے۔

(۴) پہلے جنگ عظیم سے پہلے کرکٹ کے کھلاڑی کو جنٹلمین کہا جاتا تھا۔

(۵) میانداد دنیائے کرکٹ کے وہ کھلاڑی ہیں جن کا بیٹنگ اوسط پہلے ٹیسٹ لے کر اب تک ۵۰ سے کم نہیں ہوا۔

(۶) ڈان بریڈمین کو آخری ٹیسٹ کی آخری اننگ میں صفر پر آؤٹ کرنے والے بولر کا نام ایرک ہولیز ہے۔

(۷) عامر سہیل ایشیا کے واحد بائیں ہاتھ کے بیٹسمین ہیں۔ جنہوں نے ڈبل سنچری اسکور کی ہے۔

میری گڑیا

ثمرین شمشیر، کراچی

میری گڑیا سب سے نرالی
نیلی نیلی آنکھوں والی
کانوں میں سونے کی بالی
کرتے پر ہے پیلی جالی
بالوں میں اک ربن ہے کالی
ہونٹوں پر ہے اس کے لالی
میرا کہنا ہنس کر مانے
بات کبھی نہ میری ٹالے
میری گڑیا سب سے نرالی
نیلی نیلی آنکھوں والی

بچّے محبّت اور توجہ مانگتے ہیں

ہلال احمد، کراچی

پیار و محبّت بچّے کا بنیادی حق ہے۔ بچّوں کے سونے کے انداز سے ان کے مزاج کا علم ہوتا ہے، وہ بچّہ جو بالکل سیدھا (چاروں شانے چت) سوتا ہے وہ جبلتاً رعب داب والی شخصیت اور پر اعتماد اور باہمت کردار کا مالک ہوتا ہے، جو بچّہ بالکل سیدھا سونے کے ساتھ اکثر ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ لے وہ دوسروں کی خدمت پر آمادہ رہتا ہے اور ترقی کرنے کے لئے کئی راستے اور سہارے تلاش کرنے کا مزاج رکھتا ہے، دونوں کروٹوں کے بل سونے والے متحمل مزاج اور ہر مسئلے کا کوئی تیسرا راستہ نکالنے والی فطرت رکھتے ہیں، کبھی جلد خوفزدہ بھی ہوجاتے ہیں، اپنے رخسار کے نیچے ہاتھ رکھ کر سونے والے سادہ لوح، معصوم، مزاجاً تندخو، جلد باز لیکن وفادار ہوتے ہیں۔ سوتے میں ہونٹ یا انگوٹھا چوسنے والے (چوسنی نہیں) ذہین اور شاطر ہوتے ہیں۔ پیٹ کے بل لیٹنے والے باہمّت، قابل اعتماد اور دوست بنانے والے ہوتے ہیں، گہری نیند والے خوش مزاج مگر ذرا منہ پھٹ ہوتے ہیں۔ کچّی نیند والے خاموش مگر دوستوں میں خوش مزاج، زیادہ دوست بنانے والے مگر بہت حسّاس ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی معرکہ بھی سرانجام دے دیتے ہیں۔

کہنے کو تو یہ مندرجہ بالا باتیں عام فہم ہیں جنہیں توجہ کے قابل نہیں سمجھا جاتا مگر دیکھا جائے تو بستر کے متعلق یہ تمام معلومات نہایت ضروری ہیں۔

بچّے کے بستر کی چادر رنگ دار، خوب صورت پھولوں، کلیوں یا خوب صورت رنگ برنگی تصاویر والی ہوں تو بچّہ انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے کرتے ہی سو جاتا ہے۔ آرام دہ بستر میں بچّوں کو گہری نیند آتی ہے۔ بچّوں کا خیال رکھئے۔

بچّے محبت اور توجہ مانگتے ہیں۔

ان کا دُکھ محسوس کیجئے

ذاھد حسین تھیبو، میرپور خاص

بچّے ہمارے ملک کا سرمایہ ہے۔ ہماری قوم کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے۔ کیا ہم اس قیمتی سرمائے کا تحفظ کر رہے ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں کے ایک بچّہ اپنی معصوم مسکراہٹ سے کتنے ہی غمگین انسانوں کا غم ایک پل میں دور کر سکتا ہے۔ ایک مفکّر نے کہا ہے کہ دنیا میں ساری خوشیاں بچّوں کی وجہ سے ہیں لیکن افسوس بچّوں کو خوشیاں دینے والا کوئی بھی نہیں۔

بچّوں کی اتنی اہمیت ہونے کے باوجود ہمارے معاشرے میں انہیں کچھ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ ''اقوام متحدہ'' کے چارٹر میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ۱۲ سال سے کم عمر والے بچّوں سے جسمانی کام نہ لیا جائے لیکن ہمارے یہاں سات یا آٹھ سال کے بچّوں سے بھی سخت جسمانی کام لیا جاتا ہے۔

کوئی بچّہ روڈ پر چھولے بیچ رہا ہے، کوئی بوٹ پالش کر رہا ہے تو کوئی ورکشاپ پر گاڑیاں صاف کر رہا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں کتابوں کے بجائے چھولوں کا برتن بوٹ پالش کرنے والا برش اور گاڑیاں صاف کرنے والا کپڑا ہے، آخر کیوں؟ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس تعلیم کی کمی اور غربت ہے۔

دنیا کے بڑے ملک ایٹمی اسلحے کے لئے تو اربوں روپے خرچ کرتے ہیں لیکن ان معصوم بچّوں پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر سکتے۔

ان کے ساتھ چلئے!! ان کا دُکھ محسوس کیجئے.....!!!

شیخ سعدیؒ کے چند اقوال زرّیں

مرسلہ: عبدالمعید فاروقی، کراچی

(۱) شرافت کا معیار علم و فضل ہے نہ کہ مال و دولت۔

(۲) لباس اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا کہ عمل۔

(۳) گناہ گاروں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔

(۴) موتی کیچڑ میں گر جانے کے بعد بھی موتی ہی رہتا ہے۔

(۵) حکمرانوں کو اقتدار کے نشہ میں ظلم نہیں کرنا چاہئے۔

ساتھی بچپن کے

صفوان احمد ۱۰ سال پنجم
انگلش ڈاکٹر حنا اکیڈمی اسکول
فلیٹ ۲ بلاک ۵/سی علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

محمد عدنان سعید ۱۴ سال ہشتم
ریاضی انجینئر شاہ لطیف کالج
۴۹۰-اے گلشن حدید فیز II ذوالفقار آباد کراچی

اطہر سلیم کمبوہ ۱۳ سال ہشتم
ریاضی آرمی لیبارٹری ہائی اسکول
کوٹ امین دین ڈاک خانہ نشاط آباد، شیخوپورہ فیصل آباد

عنبرین اقبال شیخ ۱۰ سال ششم
سائنس ڈاکٹر پاکستان ایمبیسی اسکول
جدہ، سعودی عرب

عنایت علی ۱۴ سال پنجم
اسلامیات ڈاکٹر حاجی اللہ بچایو خاصخیلی
موٹیانی محلہ تھانہ بھولا خان دادو، سندھ

عادل غیاث ۹ سال دوم
انگلش فوجی بننا حبیب پبلک اسکول
مکان نمبر ۱۲۴۴، ۴/ڈی میٹروول کراچی ۱۶

سائرہ شفیع خان ۱۰ سال پنجم
انگلش ڈاکٹر آغا خان اسکول گارڈن
سی ون ایریا، لیاقت آباد، کراچی

عدنان عزیز بلوچ ۱۲ سال ہفتم
سائنس آئی اسپیشلسٹ پاکستان ایمبیسی اسکول
محلہ عزیزیہ، جدہ، سعودی عرب

ہرجیت سنگھ ۱۱ سال پنجم
اردو ڈاکٹر اقبال ماڈل اسکول
ڈاگئی محلہ پارہوتی - مردان

محمد خالد احمد ۱۳ سال ششم
اسلامیات مجاہد
۱۹۷/اے، یوسف پلازہ فیڈرل بی ایریا کراچی

دانش اقبال ۱۲ سال ششم
انگلش بزنس مین سپر ماڈل اکیڈمی
۳/۱۲۲۹ حسین آباد، فیڈرل بی ایریا - کراچی

غریب بچے کی معصومیت

ایک غریب بچہ کسی حکیم کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ بیمار ہے اور دوائی کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں۔ حکیم رحمدل آدمی تھا۔ اس نے بچے کی نبض چیک کی پھر کہا۔ ''تمہیں بھوک کی بیماری ہے۔ چوں کہ دوپہر کا وقت ہے اس لئے آؤ میرے ساتھ کھانا کھالو۔''

غریب بچے نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا پھر ایک لمبی سے ڈکار لینے کے بعد بڑی معصومیت سے حکیم صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''حکیم صاحب! میرے گھر کے تمام افراد بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ اجازت دیں تو انہیں بھی آپ کے پاس لے آؤں۔''

مرسلہ جاوید اقبال، کراچی

گدھے کا بچہ

ایک گدھا ایک مکان کے باہر کافی دیر سے کان لگائے کھڑا تھا۔ سامنے سے ایک بیل کا گزر ہوا۔ بیل نے گدھے سے پوچھا ''یہاں کان لگائے کیا ہے ہوں؟'' گدھے نے کہا ''اندر سے دو ۔۔ ویں آرہی ہیں۔ ایک کہہ رہا ہے ''تم گدھے کے بچے ہو۔ دوسرا کہہ رہا ہے نہیں! تم گدھے کے بچے ہو۔'' میرا بچہ بھی کل سے غائب ہے۔ میں انتظار میں ہوں کہ وہ باہر آئیں تو دیکھوں ان میں سے کونسا میرا بچہ ہے۔؟''

مرسلہ عبد الوحید، کراچی

بھائی چارہ

استاد ''سلیم ''بھائی چارے'' کو جملے میں استعمال کرو۔'' سلیم ''ابو نے جب دودھ والے سے پوچھا کہ دودھ اتنا مہنگا کیوں بیچتے ہو تو وہ بولا ''بھائی چارہ جو مہنگا ہو گیا ہے۔''

بچہ اور میڈم

ایک اسکول میں پہلی جماعت میں داخلے کے لئے بچوں کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ جب ایک چھوٹے سے بچے کی باری آئی تو میڈم نے اسے اپنے سامنے والی کرسی بٹھایا۔ بچے کی ماں میڈم کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور اشارے سے بچے کو جوابات بتانے لگی۔ میڈم نے بچے سے پوچھا

''مُنّے میاں! دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟''

ماں نے فوراً انگلیوں کی مدد سے بچے کو چار کا اشارہ کیا اور بچے نے جواب دیا۔ ''چار۔''

پھر میڈم نے بچے سے پوچھا۔ ''اچھا تین میں سے اگر دو نکال دیں تو کتنے بچیں گے؟'' ماں نے ایک انگلی کا اشارہ کیا اور بچے نے آرام سے بتا دیا۔ ''ایک'' میڈم نے بچے کو شاباشی دی پھر پوچھا۔ ''اچھا دو میں سے دو نکالیں تو کتنے بچیں گے؟''

ماں نے فوراً انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ایک گول دائرہ بنا کر صفر کی اشارہ کیا۔ بچے نے اشارہ دیکھا اور کہا۔ ''سوراخ۔''

مرسلہ: سعید احمد خان، کراچی

حیرت انگیز اور دلچسپ

مولا بخش، شادمان ٹاؤن، کراچی

(۱) آبشار نیا گرا کے پانی کی رگڑ سے چٹانوں کے گھسنے کی موجودہ رفتار کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اندازہ لگایا گیا ہے کہ آئندہ پچّیس ہزار سالوں میں اس آبشار کا وجود ختم ہو جائے گا۔

(۲) برطانیہ میں ایک بلّی نے چوہے کو پالا اور بڑا کیا یہ واقعہ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ یہ بلّی فرانس سے تعلق رکھتی ہے۔

(۳) بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ بحیثیت گورنر جنرل صرف ایک روپیہ تنخواہ لیتے تھے۔

(۴) ایکسرے ایک جرمن کیمیا دان کی دریافت ہے۔ دنیا کا پہلا ایکسرے اس جرمن کیمیا دان ولیم کی بیوی کے ہاتھ کا تھا جو اتفاقیہ طور پر ان شعاعوں کے سامنے آگیا تھا۔

سوالات کا انعامی مقابلہ

سوالات غور سے پڑھیے اور ۱۲ اپریل تک ہمیں ان سوالوں کے جوابات بھیج دیجئے۔ تمام سوالوں کے درست جوابات ارسال کرنے والے ساتھیوں کو "پنسل بکس" انعام میں دی جائیں گی۔ (ادارہ)

۱) اگر آپ کسی خاص مسئلے پر سوچ رہے ہوں تو نیند کیوں دور چلی جاتی ہے۔؟

۲) سمندر میں جھاگ کیوں پیدا ہوتا ہے۔؟

۳) موسمِ خزاں میں پتّے زرد کیوں ہو جاتے ہیں۔؟

۴) پانی سے بھری بالٹی تیزی سے چاروں طرف گھمائی جائے تو پانی کیوں نہیں گرتا۔؟

۵) گوشت خور پودے گوشت خور کیوں ہوتے ہیں۔؟

۶) بتایئے بعض پھول صرف رات ہی کو کیوں مہکتے ہیں۔؟ مثلاً (رات کی رانی)۔

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ________

رقم ________ بذریعہ ________

پتہ ________

____

فون نمبر ________

بات بنتی ہے تو BUNNY'S سے

REGD. No. M-266 APRIL 1993
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

Put
A PANDA IN YOUR PURSE

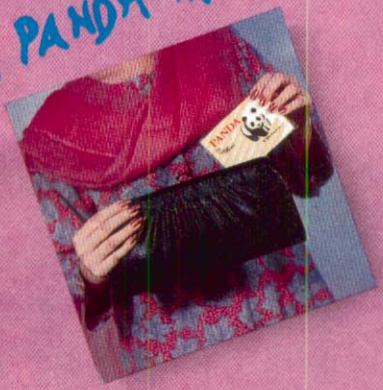

A PANDA IN YOUR POCKET

A PANDA IN YOUR PACK

ROSE PETAL®
PANDA
PACK Made from 100% imported wood pulp.

At school, at work or while shopping, hygienic and disposable tissues – so easy to carry!
Hygienic, disposable, easy to carry.
NEED OF THE DAY
A PRODUCT OF PACKAGES LTD.